امجد حیدر آبادی اور ویمنا کا تقابلی مطالعہ

مقالۂ تحقیق برائے پی ایچ۔ ڈی۔

از

محمد امین اللہ

ایم۔اے۔

زیرِ نگرانی

پروفیسر بشیر احمد ایم۔اے۔،پی ایچ۔ڈی۔

چیرمن، بورڈ آف اسٹڈیز

شعبۂ عربی فارسی و اردو

یس۔ وی۔ یونیورسٹی ، تروپتی

آندھرا پردیش

اپریل ۔2004

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تعلیم کے زمانہ ہی سے مجھے اردو شاعری سے دلچسپی رہی ہے۔ شاعری میں بھی فلسفہ، اخلاقیات، حقائقِ حیات اور روحانیت وغیرہ جیسے سنجیدہ موضوعات سے مجھے خاص لگاؤ ہے۔ ان کے مطالعہ سے مجھے ایک طرح کا سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں زندگی کا حق ادا کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ میری یہ تمنا تھی کہ میں اپنے اس ذوقِ شعر وفلسفہ کو باقاعدہ طور پر کوئی تحریری شکل دوں۔

ایم۔اے۔ کے بعد جب میں نے پی ایچ۔ڈی۔ میں داخلہ لیا تو میرے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ میں کس عنوان پر تحقیقی کام کروں۔ چناں چہ اپنے گائیڈ پروفیسر بشیر احمد صاحب سے تبادلۂ خیال کیا تو موصوف نے میری دلچسپی اور علاقائی زبان تلگو سے میری واقفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ طئے کیا کہ میں اردو کے مشہور رباعی گو صوفی شاعر حضرت امجؔد حیدر آبادی اور تلگو کے عوامی شاعر یوگی ویمنؔا کا تقابلی مطالعہ کروں۔ مجھے آپ کا یہ زریں مشورہ بہت پسند آیا اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

میرے سامنے دوسرا مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ویمؔا کی تلگو شاعری کا ترجمہ اردو کے شعری مزاج کے مطابق کیسے کیا جائے؟ بہت غور وفکر کرنے کے بعد میں نے اور میرے نگران کار نے یہ فیصلہ کیا کہ ویمؔا کی شاعری کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ اس طرح اصل تلگو شعر کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے ویمؔا کے پدوں کا سادہ اور سلیس اردو میں نثری ترجمہ کرنے کی سعی کی ہے۔

حضرت امجؔد حیدر آبادی اور ویمؔا دونوں صوبہ آندھرا پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر چند ان دونوں شاعروں کے ادوار میں دوسو سے ڈھائی سو سال کا فرق ہے۔ مگر ان کے فن اور فلسفہ میں کئی طرح کی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت امجؔد نے اپنے کلام

کے ذریعہ روحانی تعلیمات اور اخلاقیات کی تبلیغ کی ہے تو ویمنا نے بھی اپنی شاعری سے اعلیٰ انسانی اقدار، مذہب کی اہمیت اور خدا کی عظمت پر زور دیا ہے۔ جب ہم ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ انسان کو انسان بنانا، اسے حقائقِ زندگی سے آگاہ کرانا، اور خدا پرستی کا درس دینا، ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

میں نے اپنے مقالہ کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اوّل ''امجد حیدرآبادی - عہد، زندگی اور شخصیت'' ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں عہدِ امجد کے سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دورِ آصفیہ اور دورِ عثمانیہ کے سیاسی، سماجی، اور ادبی پس منظر کا مختصر سا جائزہ لینے کے علاوہ عہدِ امجد (۱۹۶۱ء-۱۸۸۶ء) میں شہرِ حیدرآباد میں پیش آنے والی سیاسی و سماجی تحریکوں اور ہنگاموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں ۱۹۰۸ء کی رودِ موسیٰ کے طغیانی کا بھی ذکر شامل ہے۔ اس حادثہ میں حضرت امجد کا سارا خاندان نذرِ آب ہو گیا تھا۔ باب کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں حضرت امجد کی حالاتِ زندگی اور ان کی سیرت اور شخصیت کو پیش کیا گیا ہے۔ ان حصوں میں آپ کے خاندان، ولادت، بچپن کے واقعات، تعلیم و ملازمت، طغیانی رودِ موسیٰ کا حادثہ، عقدِ ثانی کی بابرکت زندگی، آپ کے اعزازات اور آپ کی وفات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بعد ازاں، آپ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بابِ دوم ''ویمنا - عہد، زندگی اور شخصیت'' ہے۔ چوں کہ ویمنا کے عہد اور زندگی کے تعلق سے کوئی مستند مواد موجود نہیں ہے لہذا اس باب کے پہلے حصہ میں ویمنا کے عہد کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں مغربی اسکالروں کی آراء، تلگو ادیبوں کے بیانات اور خود ویمنا کے پدوں کا سہارا لیتے ہوئے اس کے عہد کو ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء تک کا درمیانی دور قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کی ذات، مقامِ پیدائش اور

تاریخِ وفات کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخِ آندھرا پردیش اور ویمنؔا کے پدوں کے حوالوں سے عہدِ ویمنؔا کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں حیاتِ ویمنؔا کی معروف کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ نیز ویمنؔا کے پدوں کے ذریعہ اس کی زندگی اور شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب سوم ''امجدؔ حیدرآبادی اور تصوف'' ہے۔ اس باب میں علمِ تصوف اور صوفی کی تعریف پر بحث کرتے ہوئے حضرت امجدؔ کے صوفیانہ کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں معرفتِ الٰہی کے مختلف منازل، علمِ تصوف کے مسائل، مذہبی تعلیمات اور انسانی واخلاقی اقدار کی اہمیت کا ذکر شامل ہے۔

بابِ چہارم ''ویمنؔا اور ویدانت'' ہے۔ اس باب میں ویمنؔا کی شاعری کے ذریعہ اس کے مذہب و مسلک کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ادویتا، شیومت اور وشنو مت جیسے مسلکوں کے متعلق ویمنؔا کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ویمنؔا نے اپنے کلام کے ذریعہ کیا تعلیمات دی ہیں۔

باب پنجم ''امجدؔ حیدرآبادی کی شاعری کے فنی محاسن'' ہے۔ اس باب کے پہلے حصہ میں شاعری سے متعلق حضرت امجدؔ کے خیالات سے بحث کرنے کے علاوہ آپ کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چوں کہ آپ صنف رباعی میں خاص مہارت رکھتے تھے لہٰذا رباعی کی تعریف، اس کے فن اور اردو رباعی کے تاریخی نشو ونما پر نظر ڈالتے ہوئے رباعیاتِ امجدؔ کا فکری وفنی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ششم ''ویمنؔا کی شاعری کے فنی محاسن'' ہے۔ اس باب میں ویمنؔا کی شاعرانہ عظمت اور اس کی مقبولیت کے اسباب کا جائزہ لینے کے علاوہ اس کی صنفِ سخن ''آٹاویلیدی'' کی تعریف اور ہیت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ویمنؔا کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب ہفتم ''امجد حیدر آبادی اور ویمنا کا ادبی وفکری تقابلی مطالعہ'' ہے۔ یہ اس مقالہ کا سب سے اہم باب ہے۔ اس میں حضرت امجد اور ویمنا کی حیات اور شخصیات کے مختلف پہلوؤں میں مماثلتیں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعد ازاں ان کے کلام کا فنی و فکری موازنہ کیا گیا ہے۔

ادبی موازنہ میں دونوں شاعروں کی شعری وفنی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور فکری تقابل میں ان کی تعلیمات مثلاً خدا کا تصور، مذہب کی اہمیت، انسانیت کا احترام، اخلاقیات کی اہمیت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ آج میرا یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ مگر اس کا ذمہ دار ہرگز میں اکیلا نہیں ہوں۔ میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس مقالہ کو مکمل کرنے میں میری مدد کی ہے۔

میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کا شکر گذار ہوں کہ اس نے میرے اس مقالہ کو منزلِ مقصود تک پہنچایا۔ بعد اللہ رب العزت کے میں اپنے والدین کا ممنون کرم ہوں کہ ان کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے طفیل میں اپنی اس تحقیقی کاوش کو مکمل کرسکا۔ میں اپنے چچا شیخ احمد حسین صاحب اور چچا شیخ ابوبکر صاحب کا بھی شکر گذار ہوں جنھوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

میں اپنے گائیڈ جناب پروفیسر بشیر احمد صاحب کا از حد ممنون ہوں جنھوں نے آغازِ تحقیق سے لے کر اختتام تک ہر طرح میری رہنمائی فرمائی اور ہمدردی وخلوص کا رویہ اختیار فرمایا جو ان کی سادہ دلی کی دلیل ہے۔ درحقیقت ان کی حوصلہ افزائی ہی ہے جو میرے مقالہ کی تکمیل کا باعث بنی ہے۔

میں اپنے مخلص استاذ جناب ڈاکٹر مظفر شہ میری صاحب کا بھی تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنھوں نے نہ صرف مجھے اپنی صحبتِ صالحہ سے مستفیض فرمایا بلکہ وہ میری تحقیقی کاوش کے علاوہ میری زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی فرمائی۔ میرے لیے وہ کیا ہیں

میں بیان نہیں کرسکتا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں جو کچھ اچھا ہے سب ان کا ہے۔

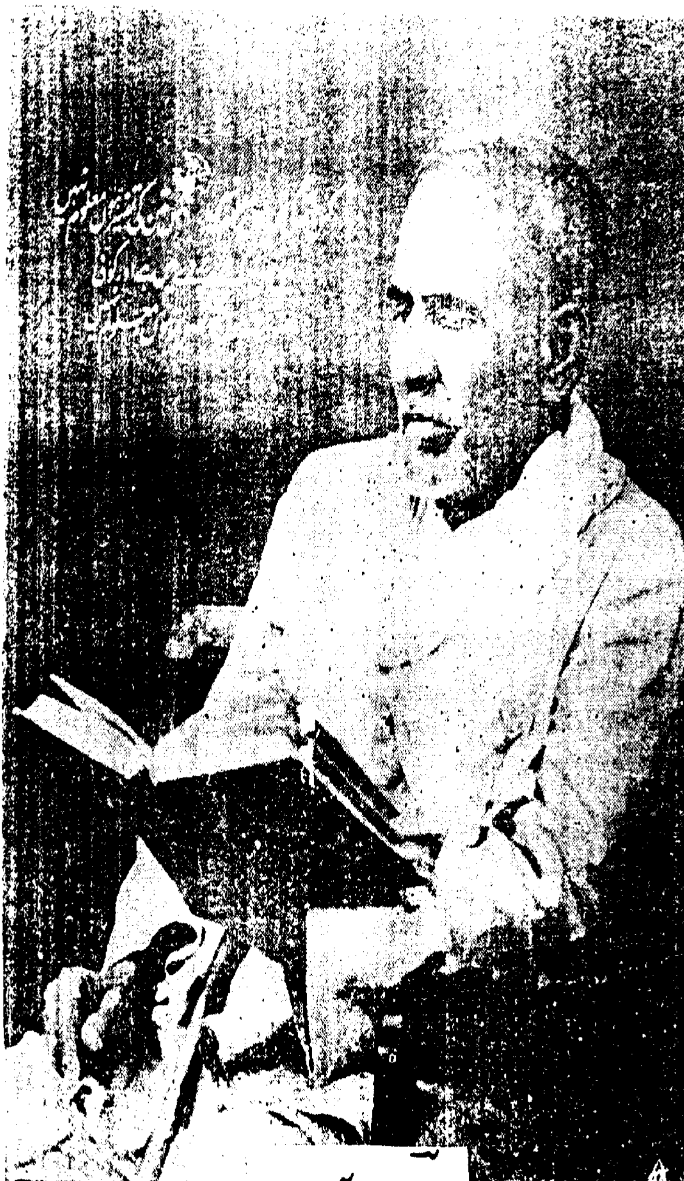
میں اپنے استاذِ محترم جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب کا بھی شکرگذار ہوں، جنھوں نے مجھے اپنے زریں مشوروں سے نوازنے کے علاوہ اپنی ذاتی لائبریری کو استعمال کرنے کا موقع دیا۔

شعبۂ تلگو کے پروفیسر نرسمہا ریڈی، روی کمار اور شن مکم صاحبان کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

میرے عزیز دوست مولانا محی الدین کا بھی میں ممنون ہوں جنھوں نے میرے مقالہ کی ٹائپنگ میں مدد فرمائی اور میرا ساتھ دیا۔ میں سید نثار احمد صاحب (مدن پلی) کا بھی ممنون جنھوں نے میرے مقالہ کو ٹائپ فرما کر نہ صرف اپنی دوستی بلکہ اپنی فراخ دلی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اور میں ڈاکٹر ریڈی باشاہ صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے کمپیوٹر سنٹر کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ مواد کی فراہمی میں اپنے مخلص دوست عطاء اللہ خان سنجری صاحب، فرزانہ صاحبہ اور رضیہ صاحبہ کا بھی میں ممنون ہوں کہ انہوں نے جہاں کہیں میرے عنوان سے متعلق کوئی کتاب دیکھی، مہیا فرمائی۔

میں اپنے تمام بھائی بہن اور دوست امروز، برکت، ضمیر، عبد البصیر، قدیر اللہ، خلیل الرحمٰن مرحوم وغیرہ صاحبان کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی مدد اور خیر خواہی سے آج یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔

محمد امین اللہ



امجد حیدر آبادی
(۱۸۸۶ء۔۱۹۶۱ء)

بابِ اوّل

امجدؔ حیدر آبادی :
عہد، زندگی اور شخصیت

ا۔ عہدِ امجدؔ:

جنوبی ہند کی سرزمین شروع ہی سے اردو شاعری کا گہوارا رہی ہے۔ یہاں 'قلی قطب شاہ' ولیؔ اور سراجؔ جیسے باکمال شاعروں نے جنم لیا اور آسمانِ شاعری کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ امجدؔ بھی اسی زمینِ زرخیز کے ممتاز شاعر ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کی دنیا میں ایک منفرد اور قابلِ قدر مقام حاصل کیا ہے۔

حضرت امجدؔ حیدرآبادی کا نام ادبی دنیا میں بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ بحیثیتِ صوفی شاعر آپ کو تعظیم کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور رباعی گوئی میں آپ ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ بلکہ آپ کا شمار صفِ اوّل کے رباعی گو شعراء میں ہوتا ہے۔

آپ کے حالاتِ زندگی، شاعری اور صوفیانہ خیالات کا مطالعہ کرنے سے پہلے ہم اس باب میں آپ کے عہد اور اس وقت کے سیاسی وسماجی اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیں گے تاکہ آپ کی شخصیت اور آپ کی شاعرانہ عظمت اُجاگر ہوسکے۔

حضرت امجدؔ کی تاریخ ولادت کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ 'حیاتِ امجد' کے مصنف محمد جمال شریف نے اپنی تصنیف میں ان کی تاریخِ ولادت ۶ رجب ۱۳۰۳ھ بہ مطابق (1886ء) بروز دوشنبہ قرار دیا ہے۔ جبکہ عظیم الدین محبتؔ نے اپنے ایم۔اے۔ کے مقالہ میں ان کی تاریخِ ولادت کو ۷، رجب ۱۳۰۵ھ بروز دوشنبہ بہ وقتِ صبح کو بتایا ہے۔ جس کی توثیق انہوں نے حضرت امجدؔ کی خودنوشت 'جمال امجد' کی اس تحریر سے کی ہے:

> ''ہم نے اپنی والدہ مرحومہ سے سنا تھا کہ نواب سالار جنگ
> اول کی وفات ۱۳۰۰ھ کے پانچ یا چھ سال بعد حیدرآباد دکن

میں ۷ رجب کو قریب صبح روز دوشنبہ ہماری نحوست کا ستارہ طلوع
ہوا۔ یعنی ہم بمعنی غم پیدا ہوئے۔ صحیح تاریخ و سن ہم کو بھی معلوم
نہیں''۔

(جمالِ امجد، ص: ۱۷)

ڈاکٹر عثمان علی اسدؔ نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ ''امجدؔ حیدر آبادی۔ حیات اور کارنامے'' میں عظیم الدین محبتؔ کے خیال کی تائید کرتے ہوئے حضرت امجدؔ کی تاریخ ولادت کو ۱۳۰۵ھ یا ۱۳۰۶ھ قرار دیا ہے۔ اس رائے کی توثیق بھی انہوں نے مذکورہ بالا تحریرِ امجدؔ سے کی ہے۔

حضرت امجدؔ کی تحریر ہذا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ پیدائش ۷رر جب کے علاوہ کوئی اور تاریخ قابلِ قبول نہیں۔ مگر سن کے تعین میں خود حضرت امجدؔ نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ حضرت امجد کی زندگی پر تصنیف کردہ سب سے پہلی تصنیف ''حیاتِ امجد'' ہے۔ اس کتاب کے حوالہ سے آپ کی سنہ ولادت ۱۳۰۳ھ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''دکن میں اردو'' میں بھی حضرت امجدؔ کی سنہ ولادت ۱۳۰۳ھ درج کیا ہے' جو مسلمہ تسلیم کی گئی ہے۔

عظیم الدین محبتؔ اور عثمان علی اسدؔ کی بتائی گئی تاریخیں ۱۳۰۵ھ یا ۱۳۰۶ھ ہیں۔ جب کہ جمال شریف کی متعینہ تاریخ ۱۳۰۳ھ ہے۔ ان دونوں میں دو یا تین سال کا فرق ہے۔ تاہم جمال شریف کی تصنیف ''حیات امجد'' کے منظر عام پر آنے سے' ان کی بتائی ہوئی تاریخ ۱۳۰۳ھ ادبی دنیا میں مقبول ہو چکی ہے۔ لہذا حضرت امجدؔ سنہ ولادت کی تاریخ ۱۳۰۳ھ لینا درست ہے۔

حضرت امجدؔ نے تقریباً پچھتر (۷۵) سال کی عمر پائی۔ اپنے آبائی وطن شہر حیدر آباد

ہی میں بروزِ چہارشنبہ ۲۹/مارچ ۱۹۶۱ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کا اس دارِ فانی کا سفر ۱۸۸۶ء میں شروع ہو کر ۱۹۶۱ء کو ختم ہو جاتا ہے۔

سیاسی و سماجی پس منظر:

آندھرا پردیش پر گول کنڈہ کے نوابوں نے تقریباً ۱۷۰ سال (۱۶۸۷-۱۵۱۲) حکومت کی۔ اس ریاست کا چوتھا نواب محمد قلی قطب شاہ ہے، جسے اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ اس نے شہر حیدرآباد کو آباد کیا تھا۔ اس خاندان کا آخری نواب ابوالحسن قطب شاہ (عرف تاناشاہ) ہے۔ اسی نواب کے دور میں گول کنڈا کی حکومت ۱۶۸۷ء میں ختم ہوئی۔

۱۶۸۲ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب دکن پر حملہ آور ہوتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد ۱۶۸۷ء میں وہ گول کنڈہ اور بیجاپور کو فتح کر لیتا ہے۔ اور اورنگ آباد کو اپنا دارالسلطنت بناتا ہے۔ گول کنڈا میں اپنے صوبہ دار کو مقرر کر کے خود مرہٹوں پر قابو پانے نکل پڑتا ہے۔ لیکن کئی برسوں تک وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ آخر کار ۱۷۰۷ء میں وہ اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مختلف علاقوں کے صوبہ دار خود مختاری کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن آپسی پھوٹ کی وجہ سے ایک کے ایک تمام صوبہ دار ختم ہو جاتے ہیں، سوائے نظام حیدرآباد کے۔

میر قمر الدین خان نظام الملک نے ۱۷۲۴ء میں دکن کے صوبہ مبارز خان کو شکست دے کر دکن میں اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ شہنشاہِ دہلی محمد شاہ نے صرف اس حکومت کو تسلیم کیا بلکہ اُسے آصف جاہ کے خطاب سے بھی نوازا۔ اُسی نے سلطنتِ آصفیہ کی بنیاد رکھی۔

نظام الملک کو دکن اور دکن کی حکومت سے کم ہی دلچسپی رہی ۔ ابتداء میں وہ مرہٹوں سے پریشان رہا۔ پھر وہ بادشاہ کی حمایت کی غرض سے دہلی چلا جاتا ہے۔ وہاں دو سال تک مقیم رہنے کے بعد ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملوں سے پریشان ہو کر دکن لوٹ آتا ہے۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہاتھ ملا کر اپنی حکومت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس افراتفری کی وجہ سے وہ دکن کی فلاح و بہبودی پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتا۔ آخر کار ۱۷۴۸ء میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔

نظام الملک کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور نواسے مظفر جنگ میں اقتدار کے لئے رسہ کشی شروع ہوتی ہے۔ فرانسی مظفر جنگ کی، اور انگریز ناصر جنگ کی حمایت کرتے ہیں۔ آخر کار مظفر جنگ کو حکومت سونپ دی جاتی ہے۔ وہ فرانسیوں کی مدد سے حیدر آباد کا نظام بنا دیا جاتا ہے۔ مظفر جنگ فرانسیوں کو شکرانہ کے طور پر کرشنا ندی کے جنوبی علاقہ عطا کرنے کے علاوہ ڈوپلکس (Duplicus) کو پانم کا وائسرائے بھی مقرر کرتا ہے۔ محض ایک سال کی مختصر سی حکمرانی کے بعد مظفر جنگ کڑپہ اور کرنول کے نوابوں کے ہاتھوں قتل کر دیا جاتا ہے۔ فرانسی جنرل، بُسّی (Bussy) ان بگڑے ہوئے حالات پر قابو پاتا ہے اور ناصر جنگ کے بھائی صلابت جنگ کو نظام مقرر کرتا ہے۔ صلابت جنگ بھی شکرانہ کے طور پر مچھلی پٹنم، نظام، کنڈاویڑا اور نرساپور فرانسیوں کو عطا کرتا ہے۔ اس طرح ساحلی آندھرا کے علاقے فرانسیوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔

۱۷۶۲ء میں صلابت جنگ کا بھائی نظام علی خاں اس سے اقتدار چھین لیتا ہے، اس کے ۴۱ سالہ (۱۸۰۳۔۱۷۶۲ء) طویل دورِ حکومت میں انگریزوں نے اس سے زیادہ سے زیادہ معاہدے کروائے، جن کی رو سے دکن کے شمالی سرکار، انگریزوں کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد فرانسیوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ حیدر آباد سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ انگریز مکمل طور پر حیدر آباد پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اور نظام ان کے

ہاتھوں میں کٹ پتلی بن کر رہ جاتا ہے۔

۱۸۰۳ء میں نظام علی کے انتقال کے بعد، اس کا بیٹا سکندر بخت تخت نشین ہوتا ہے۔ اس کے چھبیس سالہ (۱۸۲۹ء ۔۱۸۰۳ء) دورِ حکومت میں انگریز حکومت کے معاملوں میں دخل اندازی کر کے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اور حکومت کو سیاسی، سماجی اقتصادی حالات سے کمزور کر دیتے ہیں۔ حکومت کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ روز مرّہ اخراجات کے لئے بھی انگریزوں سے قرض لینا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ شاہی زیورات بھی گروی رکھے جاتے تھے۔ عوام میں نظامی حکومت پر اعتماد دھیرے ختم ہوتا جاتا ہے۔

انگریز ناصر الدولہ (۱۸۷۵ ۔ ۱۸۲۹ء) سے ۱۸۵۲ء میں زبردستی ایک معاہدہ کرواتے ہیں۔ جس کی رو سے بیدر اور رائے پور جیسے زرخیز علاقے کمپنی کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ اس جبری معاہدہ کے غم میں دیوان سراج الملک چند ہی دنوں میں دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ دیوان سراج الملک کے بعد اس کا بھانجا تراب علی خان دیوان کے عہد پر فائز ہوتا ہے، جو بعد میں سالار جنگ کے لقب سے مشہور ہوتا ہے۔

یہ واقعات شاہد ہیں کہ نظام کی حکومت برائے نام تھی۔ اصل حکمراں انگریز تھے، جو حکومت کے معاملات میں مکمل طور پر داخل اندازی کرنے کے علاوہ عوام الناس میں نظام کے خلاف جذبات بھی بھڑکاتے پھرتے تھے۔ ان پُر آشوب حالات میں عوامی بغاوت کے بھڑکنے کے بہت اندیشے تھے۔ مگر سالار جنگ کی فلاحی و اصلاحی پالیسیوں نے ہر طرح کی بغاوت کا سر کچل دیا اور ایک بار پھر امن و امان کی جھلک نظر آنے لگی۔

تاہم یہ تمام اصلاحات جاگیرداری نظام کو تقویت دینے والی تھیں۔ سید محمد جواد رضوی اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’انہوں نے کوئی زرعی اصلاحات شروع نہیں کیں، جو۔۔۔

جاگیرداری ڈھانچے پر کسی قسم کی آنچ آئے۔ بلکہ انہوں نے ضلع بندی اور زمیں پر محاصل عائد کرنے کا طریقہ رائج کر کے لڑکھڑاتے ہوئے جاگیرداری سماج کو سہارا دیا۔۔۔۔انہوں نے کئی اسکول اور کالج قائم کر کے جدید تعلیم کی بنیاد رکھی، لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ یہ تمام اسکول اور کالج صرف شہر حیدرآباد تک محدود تھے''۔

(ریاست حیدرآباد میں جدوجہد
آزادی، ص: ۱۲۹،۱۳۰)

مذکورہ تعلیمی سہولتوں سے استفادہ صرف جاگیردارانہ طبقات اور اعلیٰ عہدہ داروں کی اولاد نے اٹھایا۔ چناں چہ ایک طرف اصلاحات مظلوم طبقہ میں باغیانہ خیالات کی راہ ہموار کرتے رہے، جو سالار جنگ کے انتقال کے بعد کھل کر سامنے آتے ہیں۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد عوامی بیداری شباب پر پہنچ جاتی ہے۔ سالار جنگ نے عوامی فلاح و بہبودی کے غرض سے اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مگر دیہی علاقوں میں موقع پرست اور لالچی سرکاری و نیم سرکاری عہدے داروں نے موقع کا خوب فائدہ اٹھایا اور عوام کو دن دہاڑے لوٹنا شروع کر دیا۔

۱۸۶۹ء میں گورنر جنرل لارڈ رپن (Lord Rippon) کی قیادت میں میر محبوب علی خان کو پورے اختیارات کے ساتھ ریاستِ آصفیہ کا حضورِ نظام تسلیم کر لیا گیا۔ حضور نظام نے تخت نشینی کے فوراً بعد ریاست بھر میں اصلاحات کا بہت بڑا سلسلہ شروع کر دیا' پولس کو چوکنا کیا' تعلیم کو عام کیا' اور عہدہ داروں کو عدل و احسان کی تلقین کی گئی۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے عالموں اور ماہرین کو بلا کر ریاست کی ترقی کے لئے ان سے مشورہ کیا گیا۔ لیکن نظام کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں، جب مفاد پرست' خود غرض لوگ اپنے اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ انگریز اس قومی نااتفاقی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی

مضبوطی سے اپنے قدم جمائے اور ساری ریاست کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔

اسی دوران ۱۹۰۸ء میں شہر حیدرآباد میں رودِ موسی میں طغیانی آئی۔ لاتعداد لوگ تباہ برباد ہوگئے۔ سینکڑوں ڈوب گئے۔ ہزاروں بے گھر ہوگئے۔ اس وقت حضرت امجؔد کا خاندان چار اشخاص یعنی والدہ، اہلیہ اور لڑکی کے ساتھ خود ان پر مشتمل تھا۔ رات کے اندھیرے میں سیلاب شروع ہوا اور دن کے چڑھتے چڑھتے حضرت امجؔد کے علاوہ ان کا پورا خاندان نذرِ آب ہوگیا۔

۱۹۱۱ء میں مسندِ حکومت آصفیہ پر ساتویں آصف جاہ کی حیثیت سے میر عثمان علی خاں تخت نشیں ہوتے ہیں۔ نواب عثمان علی خان کے دور میں حیدآباد کی جو ترقی ہوئی وہ اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ وہ شعبۂ تعلیم ہو یا محکمۂ پولیس، یا شعبہ صحت یا تالیف و ترجمہ، یا پھر زبان کی ترقی، اس دور کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ اس کا اثر ساری دنیا پر پڑتا ہے۔ اس جنگ میں شامل ہونے کے لئے ملک کے کونے کونے سے آدمی بھیجے گئے۔ جنگ کے اخراجات اصول کرنے کے لئے ملک بھر میں چندہ اصول کیا گیا، جس کا لازمی اثر غریب عوام پر پڑا۔ اور عوام میں بے چینی، بڑھ گئی۔ دوسری طرف انقلابِ روس (۱۹۱۷ء) کا اثر ساری دنیا پر چھاتا رہا۔ ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ طبقے میں بیداری آنے لگی۔ اسی زمانہ میں ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، جس کو ملک بھر میں ہندوستانی زبان کی پہلی یونی ورسٹی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

۱۹۲۵ء میں ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آگیا۔ اور سارے ملک میں یہ پارٹی مقبول خاص وعام ہونے لگی۔ حیدرآباد میں ۱۹۲۷ء میں لگ بھگ کمیونزم ایک اہم سیاسی نظریہ کے طور پر ابھر کر مقبول ہو رہا تھا۔ اس کا اثر حیدرآباد کی ادبی و سیاسی

سرگرمیوں پر بھی پڑا۔

نو جوان طبقہ خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں زیادہ جوشِ عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ حیدرآباد میں ۱۹۳۹ء میں کمیونسٹ پارٹی ایک بڑی پارٹی کا روپ اختیار کر لی۔ جن دنوں کمیونسٹ پارٹی حیدرآباد میں زور پکڑ رہی تھی اسی وقت اتحادالمسلمین بھی ایک فعّال انجمن کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بہادر یار جنگ نے اس انجمن کی صدارت کی کرسی سنبھالی۔ اور انھوں نے قوم کی فلاح و بہبود میں جس تیزی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ چناں چہ ریاست کی تمام سیاسی پارٹیاں منسوخ ہو کر صرف یہی ایک انجمن سیاسی طور پر سرگرم رہتی ہے۔

۱۹۴۴ء میں قائدِ ملت بہادر یار جنگ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اور ۱۹۴۶ء میں قاسم رضوی کو انجمن کا صدر بنا دیا جاتا ہے، جو عوام میں بے حد مقبول تھے۔ جس وقت ہندوستان بھر میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے اس وقت تقسیم ہند کے بھی چرچے ہونے لگے تھے۔ ریاستِ حیدرآباد کے تعلق سے بھی کئی طرح کی باتیں کہی جانے لگیں۔ کوئی اس ریاست کو ہندوستان میں ضم کرنا چاہتا تھا تو کوئی پاکستان میں۔ اور کوئی اسے علاحدہ ملک کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حیدرآباد کے مقامی لوگوں نے قاسم رضوی کی قیادت میں ایک تنظیم بنائی۔ اس کا نام رضاکار تنظیم تھا۔ اس کے مقاصد میں حیدرآباد کی سرحدوں کی حفاظت یہاں کے عوام اور ان کا تہذیبی تشخص کو قائم رکھنا اور تقسیمِ ہند کے سیاسی اور سماجی اثرات سے اس کو محفوظ رکھنا شامل تھا۔ یہ تنظیم بڑی فعّال تھی۔ اس تنظیم میں صرف مسلمان ہی نہیں تھے، بلکہ ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ بالخصوص ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اس تنظیم میں موجود تھی۔

مختلف سیاسی پارٹیوں کی بے پناہ سرگرمیوں کے پس منظر میں تقسیمِ ہند کے بعد

ہندوستان آزاد ہوتا ہے۔ اور پاکستان کا قیام عمل میں آتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا اثر ریاستِ حیدرآباد پر بھی پڑا۔ لوگ افراتفری اور بے چینی کا شکار ہونے لگے۔ حیدرآباد کا مستقبل بھی غیر یقینی ہوگیا تھا۔ رضا کار تنظیم چاہتی تھی کہ ریاستِ حیدرآباد کا تشخص قائم رہے، نہ ہندوستانی حکومت اور نہ پاکستانی حکومت میں ضم ہو۔ چناں چہ ریاستِ حیدرآباد کے عوام اپنی ریاست کے مستقبل کے تعلق سے بے چین تھے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے حیدرآباد کو ہندستان میں ضم کرنے کی تجویز پیش کی۔ پنڈت نہرو اور لارڈ مونٹ باٹن نے اس تجویز کو پسند کیا۔ مگر حضورِ نظام نے اس پیش کش کو نامنظور کیا اور یہ اعلان کروایا کہ حیدرآباد کسی بھی ملک کے ساتھ ضم نہ ہوگا' اور اپنا سیاسی تشخص برقرار رکھے گا۔ اس بات پر ریاست میں بڑی مخالفتیں ہوئیں۔

۱۳ستمبر ۱۹۴۸ء میں حکومتِ ہند کی جانب سے پولس ایکشن کیا گیا۔ ہندوستانی فوج نے ریاستِ حیدرآباد پر حملہ کیا۔ ادھر رضا کاروں نے بھی ان کا مقابلہ کیا۔ تاہم تعداد کی کمی اور خاص طور پر اسلحہ کی قلت کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ پولس ایکشن میں رضا کاروں کے علاوہ عام شہریوں کو بھی جانی و مالی نقصان پہنچا۔

پولس ایکشن کے بعد ریاست حیدرآباد کو ریاستِ ہند میں ضم کرلیا گیا۔ اور یکم نومبر ۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش کی تشکیل عمل میں آئی۔

ادبی پس منظر:

دکن کی گول کنڈا ریاست اردو کی نشونما میں اپنی مثال آپ ہے۔ نظام شاہی عادل شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد قطب شاہی خاندان نے دکن پر نہ صرف حکمرانی کی بلکہ علم وادب کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس خاندان کے سبھی حکمرانوں نے

شعروادب کو بڑھاوادیا اور اردو زبان کی نشونما میں حصہ لیا۔ ان حکمرانوں میں تقریباً سبھی شاعر تھے۔ بعضوں کے دیوان بھی موجود ہیں۔ ان حکمرانوں میں قلی قطب شاہ کے زمانہ میں اردو زبان وادب کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔ اس دور کو اردو کے ابتداء کا زرین دور کہا جا سکتا ہے۔ اس حکمران نے اردو کے شعروادب کی اور اردو شعراء کی سرپرستی قطب شاہی خاندان میں سب سے بڑھ کر کی تھی۔ یہ خود شاعر تھا۔ ہر صنفِ سخن پر اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے دیوان میں مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزل، رباعیات سب شامل ہیں۔ اس دور میں شاہی افراد کے علاوہ جن لوگوں نے شعروادب کی ترقی وترویج میں حصہ لیا ان میں اس وقت کے درباری شاعر، صوفی اور سنت اہم ہیں۔ جن میں ملا وجہی، غواصی، قطبی، ابنِ نشاطی وغیرہ مشہور ہیں۔

قطب شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد دکن کی حکومت مغلیہ خاندان کے حصہ میں آئی۔ نئے حکمران اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اور وہاں سے حکومت کی کاروائی انجام دینے لگا۔ تبدیلئی حکام کے باوجود دکن میں اردو شعروادب کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ البتہ علم وادب کا گہوارہ اردو شاعری کا مرکز اب بجائے گول کنڈا کے اورنگ آباد تھا۔ اورنگ آباد کے رنگ کو پیش کرتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''اورنگ آباد نہ صرف سلطنتِ مغلیہ کا مستقر ہونے کے لحاظ سے دہلی کے امراء، ورساء، علماء اور شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گول کنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھر گیا۔ شعروشاعری کا چرچا بڑھا۔ اس طرح اردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعراء نے اپنی یادگار میں بہترین کلام کو یادگار چھوڑا۔''

(دکن میں اردو۔ ص:۲۹۹۔۲۹۸)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مغلیہ دور میں اردو زبان وادب کے لئے ماحول بہت سازگار تھا۔ اس دور میں جن شعراء نے شہرت پائی ان میں ولیؔ کا نام کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ جنہوں نے شمالی ہند میں اردو غزل کی ترویج کی تھی۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد آصفیہ حکومت وجود میں آئی، جس کے پہلے نواب نظام الملک کی آصف جاہ تھے۔ آصف جاہی سلاطین علم پرور اور علم وفضل کے پرستار تھے۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی انھوں نے عوام کی ذہنی واخلاقی تربیت پر بھی زور دینا شروع کردیا۔ جگہ جگہ سے نہ صرف علماء کو جمع کیا بلکہ ان کی ہمت افزائی بھی کی۔ مختلف درس گاہیں کھولیں۔ اس دور میں جس تیزی سے اردو زبان نے ترقی کے منازل طئے کئے اس کی مثال دکن کے کسی اور دور میں کم ہی ملتی ہے۔ نصیرالدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

> ’’حکومت آصفیہ میں زبان اردو کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ نہ صرف بڑے بڑے شعراء نام آور پیدا ہوئے اور نظم ونثر کی کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ دیگر مراتب بھی طئے پائے ہیں، جن سے اردو کی ترقی میں مدد ملی‘‘

(دکن میں اردو۔ ص:۳۶۵)

آصفیہ خاندان تقریباً ۲۲۸ سال (۱۹۴۸ء۔۱۷۲۰ء) دکن پر حکمراں رہا۔ جن کو ادبی لحاظ سے چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۷۲۰ء تا ۱۸۰۲ء تک کے پہلے دور میں سید سراج الدین سراجؔ، عاجزؔ، قیاسی وغیرہ شعراء کے نام اہم ہیں۔ سراجؔ دیوان کے علاوہ مثنوی ’’بوستانِ خیال‘‘ بھی لکھی۔ عاجزؔ مثنوی ’’لال وگوہر‘‘ کے علاوہ ایک دیوان بھی بطور یادگار چھوڑا۔ قیاسیؔ نے طوطی نامہ کے طرز پر ایک مثنوی لکھی۔ اس دور کے شعراء کے ہاں حمد، نعت، قصائد، جنگی کارناموں کے ذکر، کہانیاں، تصوف کے موضوعات کا ذکر ملتا ہے۔

اس دور میں نثری نمونے کم ملتے ہیں۔ ان میں چند ایک یہ ہیں: معرف السلوک اور اسرار التوحید۔ ان کا موضوع تصوف ہے۔ جہاں تک ارتقائے نثر کا تعلق ہے یہ اردو کا ابتدائی دور ہونے کی وجہ سے نثر روانی سے عاری ہے۔

دورِ دوّم ۱۸۰۲ء سے شروع ہو کر ۱۸۸۵ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلہ میں سابقہ دور سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ اس دور میں ناطقؔ نے قصہ شہیدااں کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ اس دور کے شعراء نے مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف سخن غزل، مرثیہ، قصیدہ، ترجیع بند وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں ایماؔ، میر عباس علی خان، احسان محمد صدیق حسینؔ خواجہ ہمت علی خاں ہمتؔ، رائے گلاب چند ہمدمؔ، ذکا نیلوری، میر احمد علی عصرؔ، ہدایت علی خان ہدایتؔ، شوقؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں نثر کو سابقہ دور سے اچھا ماحول ملا۔ فارسی کے علاوہ انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کئے جانے لگے۔ مغربی زبان سے سائنس کی کتابوں کا ترجمہ اس دور کا تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

> ''اس دور میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کی ابتداء ہوئی۔ سائنس کی کتابیں اردو زبان میں منتقل ہونے لگیں اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں بھی کثرت سے تصنیف ہوئیں۔''

(دکن میں اردو۔ ص:۴۶۹)

آصفیہ کا تیسرا دور (۱۸۸۵ء ۔ ۱۹۱۸ء) سابقہ دونوں ادوار سے کم مدت پر محیط ہے اس دور کا آغاز ۱۸۸۵ء میں ہوتا ہے، اور محبوب علی خان آصف جاہ سادس کی حکمرانی کے خاتمہ کے ساتھ ہی انتہا کو پہنچتا ہے۔ یہ دور قلیل مدت پر ہونے کے باوجود اردو کے لئے بہت سازگار اور کارآمد دور ثابت ہوا۔ ۲۱ فروری ۱۸۸۴ء میں اردو کو برطانوی زبان قرار دینے سے اس زمان کو سیاسی، سماجی، وثقافتی پہچان ملی۔ روزنامے، ہفتہ واری، ماہ

نامے'' اور پرچے منظر عام پر آرہے تھے۔ دکن میں پھیلی اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> '' دکن کی اس دور کی کششِ مقناطیس نے اطرافِ ہند کے اساتذائے اردو کو اپنے دامنِ عاطفت میں کھینچ لیا اور حیدرآباد علم وفن کا مرکز بننے لگا۔''

(دکن میں اردو۔ص:۵۴۵)

اور یہ حقیقت ہے کہ ممتاز و معروف شعراء وادباء نے دکن کا رخ کیا تھا۔ ان میں سے بعض یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اور بعضوں کا طویل مدت تک یہاں قیام رہا۔ داغؔ دہلوی اپنا وطن ترک کر کے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا۔ امیرؔ بھی یہیں بس گئے۔ اردو کے معروف ناول نگار رتن ناتھ سرشار اور عبد العلیم شررؔ عرصہ دراز تک یہاں رہ کر اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مولانا شبلی نے دورانِ قیام حیدرآباد' الغزالی'' ، ''موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ'' جیسی کتابیں لکھیں۔ حاکم وقت محبوب علی خاں بھی شاعر تھے۔ انہوں نے اردو، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کے علاوہ مزاجؔ' احمد عبد العزیز ولاؔ' میر اعظم علی شائقؔ، شعلہؔ، قاتلؔ' شوکتؔ وغیرہ نے بھی متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔

اس دور میں ایسے شعراء بھی ہیں جن کی عمر کا ایک حصہ آگے چل کر دورِ عثمانی میں گزرتا ہے۔ ان میں سرِ فہرست سید احمد حسین امجدؔ ہیں' جو امجدؔ حیدرآبادی کے نام سے مقبول ہیں۔ جن کی تصانیف رباعیات امجدؔ (حصہ اول' دوم اور سوم)' ریاض امجدؔ (حصہ اول، دوم)' خرقۂ امجدؔ، نذرِ امجد، جمالِ امجد، حجِ امجد، حکایات امجدؔ، پیامِ امجدؔ' گلستان امجدؔ وغیرہ پر مشتمل ہے۔ محمد حسین آزادؔ بھی اسی زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ جنہوں نے خیالاتِ آزادؔ کے نام سے اپنے کلام کے دو حصہ شائع کئے۔ ان کے علاوہ عظمت اللہ خاں

کی مختصر نظمیں اور نظم طباطبائی کے قصائد، فانی بدایونی کی غزل گوئی اور انگریزی نظموں کے ترجموں نے اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔

اس دور میں ایسے نثّار بھی پیدا ہوتے ہیں جو شاعر بھی تھے اور جن کا کلام باقاعدہ طور پر رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ ان میں امجؔد حیدرآبادی' مہاراجہ کرشنا پرساد' ذہیؔن' عظمت اللہ خاں وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

حکومتِ آصفیہ کا چوتھا دور ۱۹۱۸ء میں شروع ہوکر ۱۹۵۵ء میں اختتام کو پہنچتا ہے۔ اس دور میں اردو کے تجربات دیگر ادوار سے مختلف رہے ہیں۔ اس دور میں اردو زبان کو عروج کے ساتھ ساتھ زوال کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پہلی جنگ عظیم کے اثر سے اردو ادب میں نئے نئے خیالات اور رجحانات داخل ہونے لگے۔ اردو ادیب و شاعر انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور روسی زبانوں سے بھی استفادہ کرنے لگے۔ ملک کے سیاسی و سماجی حالات مندرجۂ بالا اثرات و تغیرات سے مل کر اردو شاعری کو ترقی پسندی کی راہ دکھا رہے تھے۔ اور اردو ادب کو ایک نقلابی راستہ پر ڈال رہے تھے۔ نصیرالدین ہاشمی نے ان انقلابی اثرات کو یوں بیان کیا ہے:

''اردو کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم آ گیا۔ ادب برائے زندگی کی تحریک اور زور و شور سے پھیلنے لگی''

(دکن میں اردو۔ ص:۔ ٦٧٦)

دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں' ہندوستان میں آزادی کی جد و جہد' تقسیمِ ہند کے ہولناک واقعات اور دکن میں سلطنتِ آصفیہ کے خاتمہ نے اس دور کے شعراء کو بہت متاثر کیا۔ ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''عشق و محبت کی فرضی داستان کے بجائے اب زندگی کے

مشاہدات بیان ہونے لگے۔عشق ومحبت کے جذبات قدیم طرز
پر رمزیت' اشاریت اوراستعاروں میں بیان کرنے کے بجائے
اب پردہ چاک کردیا جارہا ہے اور رازداروں کو پردہ کی جھلک
نظر آنے لگی ہے۔''

(دکن میں اردو' ص:٦٨٠)

دیگر ادوار کی طرح اس دور میں بھی اردو شاعری نے خوب ترقی کی۔آصفیہ خاندان کے اس آخری دور کے حکمراں میر عثمان علی خان سالع کو شاعری سے دلچسپی تھی' اور عثمان تخلص کرتے تھے۔اس دور میں علی اختر واقعہ نگاری اور نیچرل کے عمدہ نمونے لئے ہمارے سامنے آتے ہیں۔اکبرالہ آبادیؔ کے نقشِ قدم پر چلنے والے عظمت اللہ بیگ اسی دور میں گزرے ہیں۔انہیں کے ہم عصر راجہ نرسنگھ راج عالؔی کے ہاں تصوف کی جھلک ملتی ہے۔ آصفیہ کے اس آخری دور میں فضل الرحمٰن کے دو مجموعے''دھوپ چھاؤں'' اور ''نقشِ حیات'' اور سکندر علی وجد کی ''لہو ترنگ'' اور ''آفتاب'' منظر عام پر آتے ہیں۔اسی دور کے ایک اہم شاعر مخدومؔ محی الدین ہیں' جن کا شمار انقلابی شعراء کی فہرست میں آتا ہے۔ وہ اشتراکی تحریک کی حمایت کرتے تھے۔''سرخ سویرا''،''گلِ تر'' ان کے مجموعے کے نام ہیں اور ''بساطِ رقص'' ان کی کلیات ہے۔

اس مختصر تاریخی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ دکن میں اردو شعر وادب کا سفر منزل بہ منزل آگے بڑھتا آیا ہے۔زمانہ کے ساتھ ساتھ انقلابات بھی رونما ہوئے ہیں۔

جس وقت امجدؔ حیدرآبادی کی شاعری (١٩٦١ء تا ١٨٨٦ھ) ادب میں اپنا مقام بنارہی تھی اس وقت اردو شاعری کے تین بڑے رنگ تھے۔ایک طرف قدیم طرز میں شعر کہنے کا رواج تھا۔غزل ان کا اہم ذریعۂ اظہار تھا۔ان کی غزلیں روایتی رنگِ تغزل سے پُر تھی۔معاملہ بندی' عاشقانہ جذبات' رنگین بیانی' ہجر ووصال کے قصوں کے علاوہ

عاشقانہ شوخی ان کے نمایاں پہلو تھے ۔ یہ رنگ عوام وخواص دونوں میں مقبول تھا۔ اس رنگ میں کہنے والوں میں داؔغ دہلوی' صفؔی اورنگ آبادی' مہاراج کرشنا پرساد' شاؔد اور حسرؔت فاؔنی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

دوسری طرف نئی نسل کے شعراء تھے' جو روایت سے بغاوت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ۔ وہ اظہارِ بیان کے نئے سانچوں کی تلاش میں تھے ۔ بعض شعراء فطرت نگاری کی طرف بھی مائل تھے ۔ اور نظم گوئی کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا تھا ۔ ان ہی دنوں میں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو نئی نسل کے بیشتر شعراء نے اس میں دلچسپی لینی شروع کی ۔ چناں چہ ان کی شاعری میں سماج' سیاست اور زندگی جیسے اہم مسائل جلوہ گر ہونے لگے ۔ ان شعراء میں مخدوؔم محی الدین سلیمان ادیبؔ' خورشید احمد جاؔمی' صمد رضوی' ساؔز اور سکندر علی وجؔد کے نام اہم ہیں ۔

تیسری طرف دکنی شاعری بھی پروان چڑھ رہی تھی ۔ حیدرآباد کی مقامی زبان میں شعر کہنے کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ شاعروں نے دکنی زبان میں بھی شعر کہنے لگے ۔ اس رنگ کی شاعری میں زیادہ تر طنز و مزاح کی چاشنی پائی جاتی تھی ۔ اور شاعر بڑی بے تکلفی سے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر طنز کیا کرتے تھے ۔ اس شاعری کی اپنی ایک اہمیت ہے ۔ اس رنگ میں کہنے والوں میں علی صائب میاںؔ' نذیر دہقاؔنی' سرور ڈانڈا اور سلیماؔن خطیب وغیرہ کے نام اہم ہیں ۔

حضرت امجؔد نے اپنی شاعری میں جو طرز اپنایا ہے' وہ ان تین طرزوں سے الگ ہے اور اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتی ہے ۔ آپ نے دکنی طرزِ شاعری اپنائی نہ ترقی پسند نظریات کی حمایت کی ، اور نہ ہی قدیم طرز بیان کو اپنا موضوع بنایا ۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں :

''حضرت امجدؔ کی شاعری حسن وعشق، گل وبلبل کے جھوٹے
تذکروں اور بے سرو پا خیالی کرشموں سے خالی ہے''

(دکن میں اردو، ص: ۵۸۲)

حضرت امجدؔ ایک فطری شاعر تھے ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں گہرے مشاہدات، خالص روحانی جذبات و کیفیات کو تصوف کا جامہ پہنانے کے ساتھ ساتھ اخلاق اور اخلاص کی اہمیت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور آپ کا کلام لطفِ زبان، سادگی، نازک خیال اور تاثیر کے اعتبار سے بھی قابلِ تحسین ہے۔

۲۔ حالاتِ زندگی:

حضرت امجدؔ کے حالاتِ زندگی کا بیشتر علم ہمیں آپ کی خودنوشت وسرگزشت ''جمالِ امجدؔ'' سے ہوتا ہے۔ جس میں آپ نے اپنی زندگی کے حالات، اہم واقعات اور تجربات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمد جمال شریف کی کتاب ''حیاتِ امجدؔ'' اور مختلف ادبی رسائل اور تذکروں میں بھی آپ کی حیات اور شخصیت پر مواد دستیاب ہے۔ تاہم ''جمالِ امجدؔ'' کو ان سب میں اہم مقام حاصل ہے۔

حضرت امجدؔ کی پیدائش دکن حیدر آباد کے ایک صوفی گھرانے میں ۱۳۰۳ھ م ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ آپ کا اصلی نام ''سید احمد حسین'' تھا۔ آپ کے والد کا نام خود حضرت امجدؔ نے اپنی تصنیف ''جمالِ امجدؔ'' میں ''رحیم علی'' لکھا ہے۔ جب کہ بعضوں نے رحیم حسین ابنِ کریم حسین لکھا ہے۔ حضرت امجدؔ نے اسکی وضاحت یوں کی ہے۔

''اس طرح نام بھی بعض نے رحیم حسین ابنِ کریم حسین کہا ہے
اور بعض نے رحیم علی۔ لیکن آخر الذکر نام چونکہ ہم نے اپنی ماں
سے سنا ہے اس لئے ہمارے پاس یہی زیادہ قابلِ وثوق ہے۔''

(جمالِ امجدؔ۔ ص:۱۸)

آپ کے والد رحیم علی صوفی مزاج، شریعت کے سخت پابند خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کے ذریعہ معاش کی بابت خود حضرت امجد نے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ مگر اتنا جانتے تھے کہ وہ اپنے آخر دنوں میں کسی مسجد میں امامت کیا کرتے تھے۔ آپ کی والدہ کا نام صوفیہ تھا، جوایک سیدھی سادی اور نیک خاتون تھیں۔ (جمالِ امجد، ص:۱۸)

حضرت امجد اپنے گھر میں اکیسویں اولاد تھے۔ قبل ازیں آپ کے والد کی یکے بعد دیگر چار بیویوں سے بیس اولاد ہو کر مر چکی تھیں۔ آپ کی پیدائش سے، ابھی والدہ محترمہ کے خوشی کے آنسو تھمے بھی نہ تھے کہ چالیس (۴۰) دن کے بعد شوہر کی وفات نے غم کے آنسو جاری کر دیئے۔ گھر میں چھلّہ کے رسم کی خوشیاں منائی جارہی تھیں کہ یکا یک وہ ماتم میں بدل گئیں۔ اس دردناک واقعہ کا بیان حضرت امجد نے یوں کیا ہے:

> ''ہمارے والد حضرت صوفی سید رحیم علی مرحوم کا ہماری والدہ سے عقد کے تین سال بعد عین ہمارے چلہّ کے دن مرض فالج سے آناً فاناً انتقال ہوگیا۔ چلہّ کی رسم سے مہمانوں سے بھرا گھر دم بھر میں ماتم کدہ ہوگیا۔ جو پانی زچہّ بچہّ نہلانے کے لئے گرم کیا گیا تھا، غسلِ میّت کے کام آیا''
>
> (جمالِ امجد، ص:۱۷)

صوفی رحیم علی کے فوت ہو جانے سے امجد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ غم نصیب بیوہ ماں کے سر پر آپڑا۔

بچپن:

جمالِ امجد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ امجد بچپن میں کافی شریر تھے۔ اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شرارتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ گھر میں سلیقہ سے رکھے ہوئے سامان کو الٹ پلٹ کرنا،

چیزیں توڑ پھوڑ ڈالنا' نئے نئے سلے کپڑوں کو قینچی سے کتر ڈالنا ہر وقت ماں کو پریشان کرنا ان کا معمول تھا۔ آپ کی والدہ آپ کی شرارتوں سے پریشان تو ہوتی تھیں، تاہم آپ کی معصومانہ حرکتوں سے لطف اندوز بھی ہوا کرتی تھیں۔ درج ذیل اقتباس سے' بیوہ ماں اور یتیم لڑکے کے درمیان محبت اور تربیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں:

''ہم کو سلیقہ سے رکھا ہوا سامان الٹ پلٹ کرنے' چیزوں کو کچلنے' توڑنے پھوڑنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔۔۔۔۔۔ ایک چیز ہاتھ سے چھین لی گئی تو دوسری پر جا پڑے ایک کام سے روکا گیا' دوسرا شروع کر دیا، دم بھر دم لینا محال' نہ ہاتھ کو چین' نہ پاؤں کو سکون، نا معلوم کس مشن کا پُرزہ ہے کہ روکنے پر بھی برابر چل رہا ہے۔ کبھی قینچی لے کر نئے سلے ہوئے کپڑوں کی کتر بیونت کر دیتے' کبھی بازار سے ابھی آئی ہوئی دوتی چاقو سے کاٹ کر چپکے سے رکھ دیتے۔ کبھی برتن توڑ توڑ کر تماشے دیکھتے' ٹوٹنے کی آواز سے کانوں کو لذت' دل کو مسرت حاصل ہوتی۔ کبھی سالن میں راکھ' کبھی راکھ میں سالن جھونک دیتے۔ گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈے پانی کی صراحیاں اُلٹ اُلٹ کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے ۔۔۔۔۔۔۔۔ والدہ ہمارے ان پُر لطف کرشموں سے تنگ آ کر توبہ' توبہ کہا کرتیں۔ اللہ اللہ یہ بھی عجیب تماشا تھا۔ گناہ ہم کرتے' توبہ ماں کیا کرتیں''۔

(جمال امجد۔۲۵)

ایک مرتبہ آپ کی والدہ سہیلیوں کے ساتھ تفریح کو نکلیں۔ امجد بھی ساتھ تھے۔ ہنسی ہنسی میں ایک سہیلی نے آپ کی والدہ کو تالاب میں دھکیل دیا۔ وہ ڈوبنے لگیں۔ سب ہنسنے لگے۔ ماں کو ڈوبتا دیکھ کر نادان امجد ماں ماں چلاتے ہوئے پانی میں کود پڑے۔ بچے کی آواز سن کر ڈوبتی ماں کی ممتا جاگ اٹھی۔ ایک ہاتھ سے سامنے کے پتھر کو پکڑ لیا اور

دوسرے ہاتھ سے ڈوبتے بچہ کو بچایا۔ اس طرح ماں کی ممتا اور بیٹے کے پیار نے ایک دوسرے کو ڈوبنے سے بچالیا۔ (جمالِ امجد، ص: ۴۲)

''جمالِ امجد'' میں اس طرح کے کئی واقعات ہیں' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیوہ ماں اور یتیم لڑکا ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کی شرارتوں کی کچی عمر کی نادانیاں سمجھ کر سہہ جاتی تھیں' مگر بیٹا شرارتیں کرنے سے باز نہ آتا تھا۔

تعلیم:

بنا باپ کے امجدؔ کو پالنے پوسنے اور تعلیم دلانے میں آپ کی والدہ نے جو مصیبتیں اٹھائیں وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ آپ کے عزیز واقارب سب مر چکے تھے' اور شوہر کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تھا۔ ان سب کے باوجود امجدؔ کی تعلیم وتربیت میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ امجدؔ کی ماں کو تحصیلِ علم کا بڑا شوق تھا۔ جس پر وہ متحیر تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''نہ معلوم ہماری اس اُمّی ماں میں تعلیم کا شوق کہاں اور کس طرح پیدا ہوگیا تھا کہ ہم سے بارہا فرماتیں' بیٹا اگر جینا ہو تو کچھ ہو کر جیو' ورنہ بہتر یہی ہے کہ مر جاؤ''۔
>
> (جمالِ امجدؔ۔ ۴۶)

مگر امجدؔ اپنی شرارتوں اور کھیل کود سے کب باز آتے۔ ماں کو ان کی تعلیم کی فکر ہر وقت لگی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں ان کی خاطر دعائیں مانگتی تھیں۔

تعلیم کے ابتدائی دور میں آپ کو ایک نہایت ہی سخت گیر استاد سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ نہایت بے رحمی سے انھیں مارا کرتے تھے۔ دونوں پاؤں کو رسّی سے باندھ کر چھت کی کڑیوں میں الٹا لٹکا دیتے تھے۔ موٹی موٹی رسیوں سے اتنا مارا کرتے تھے کہ آپ کے منہ

سے کف جاری ہو جاتا تھا۔ یہ سب سختیاں ماں کے سامنے ہوا کرتی تھیں۔لیکن وہ اُف تک نہ کرتیں۔دل ہی دل میں رولیا کرتی تھیں۔ چنانچہ امجدؔ مدرسہ جانے سے ہمیشہ کترایا کرتے تھے۔اکثر آپ وہاں سے بھاگ جاتے اور بہانے ڈھونڈا کرتے کہ کس طرح پڑھائی سے دور رہا جاسکتا ہے۔ایک مرتبہ کتاب کو کھلی چھوڑ کر' وہ پانی پینے کے لئے گئے ہوئے تھے کہ اتنے میں کھونٹی سے بندھی ہوئی' استاد کی بکری کھل گئی اور کتاب کو چبا گئی۔اس واقعہ سے انھیں یہ خیال آیا کہ اس طرح پڑھائی سے بچا جاسکتا ہے چناں چہ اس وقت سے آپ کا جب جی چاہتا بکری کو کھول دیتے اور وہ کتاب کو چٹ کر جاتی آپ اس دن پڑھنے سے چھوٹ جاتے۔اس طرح کے بہانے تلاش کر کر کے وہ پڑھائی سے بچ جایا کرتے تھے۔

امجدؔ کا اس طرح پڑھائی میں دلچسپی نہ لینا' اور سارا دن مدرسہ سے غائب رہنا ان کی ماں کے لئے موجبِ غم تھا۔وہ خدا سے دعائیں کرتیں کہ ان کا بیٹا پڑھائی میں دل لگائے۔مگر وہ کسی طرح اس طرف ملتفت نہیں ہو رہا تھا۔ان ہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا' جس سے امجدؔ کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ایک مرتبہ آپ کے گھر کے سامنے سے' پالکی میں سوار ہو کر کوئی امیر جا رہا تھا۔والدہ نے' پالکی سواروں اور کہاروں کو دکھلاتے ہوئے امجدؔ سے پوچھا:

> '' دیکھو اور اچھی طرح دیکھو' ایک آدمی پالکی میں سوار ہے۔ ایک آدمی پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ بتاؤ ان دونوں میں تم کو کس کی زندگی پسند ہے۔ہم نے کہا پالکی سوار کی' ـــــــ۔ کہا ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہوسکتی' اگر نہ پڑھوگے تو تم کو بھی اس دوسرے آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑنا پڑے گا، اب جو صورت چاہو اختیار کرلو''۔
>
> (جمال امجدؔ ص:۵۴)

اس واقعہ کے بعد امجد کی آنکھیں کھل گئیں ۔ ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنی لایعنی حرکتوں سے توبہ کر کے تحصیلِ علم میں جٹ گئے ۔ لکھتے ہیں :

''وقت کی بات گفتگو کا اثر اس پیش پا مثال سے ہم بہت سہم گئے
اور آئندہ کھیلنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا۔''

(جمالِ امجد ۔۵۴)

اس طرح آپ نے گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دکن حیدر آباد کے اسلامی مدرسہ جامعہ نظامیہ میں داخل کرا دئے گئے ۔ جہاں انہوں نے چھ سال تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد ان کی کہیں بھی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی ۔ اس دوران آپ مولوی سعید الدین سہارن پوری، مولوی عبدالوہاب بہاری جیسے نامور اساتذہ سے فیض حاصل کیا ۔ نیز حکیم سید نادرالدین نے آپ کی فطری صلاحیتوں اور اعلی کردار کی تشکیل میں حصہ لیا ۔ ۱۳۱۶ھ میں مدرسہ جامعہ نظامیہ کے وظیفہ خواروں میں شریک ہو گئے اور وہاں پر منطق کی ایک کتاب قطبی تک تعلیم پا کر مدرسہ چھوڑ دیا ۔

ملازمت :

مدرسہ چھوڑنے کے بعد امجد کو سخت مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا ۔ اس دوران شہر حیدر آباد میں مہنگائی بھی بڑھ گئی تھی ۔ اب تک آپ کے والد مرحوم کے چھوڑے ہوئے مکانات بیچ بیچ کر گذارا کر رہے تھے ۔ اب وہ بھی نہ رہے ۔ تنگ دستی کے ان حالات میں محض ماہانہ دو روپیوں کی خاطر امجد ایک لڑکی کو پڑھانے چار میل پیدل جایا کرتے تھے ۔ ان ہی حالات میں جب آپ کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی ، آپ کی پہلی شادی شیخ میراں صاحب کی لڑکی محبوب النساء بیگم سے کر دی گئی ۔ اور ان کی بطن سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئیں ۔

اعظم النساء کی ولادت کے دو سال کے بعد امجدؔ کسی خانگی وجہ سے اپنی ماں سے بگڑ کر بنگلور چلے گئے۔ وہاں چار مہینوں تک آپ کا قیام رہا۔ اس دوران آپ ایک عیسائی اسکول میں درس دیا کرتے تھے۔ وہاں کے عیسائیوں اور پادریوں سے مذہبی مباحث میں شریک ہوتے اور دینِ اسلام کی عظمت و بزرگی کو بیان کرتے۔ یہاں تک کہ اتوار کے دن پادری صاحب کے ساتھ شہر میں جایا کرتے تھے۔ ایک طرف پادری صاحب عیسائیت کی تبلیغ کرتے تو دوسری طرف حضرت امجدؔ محمدیؐ کی تبلیغ کیا کرتے۔ کچھ لوگ انہیں عیسائی سمجھتے تو کچھ مسلمان۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ ان کے مخالف ہو گئے اور کچھ ان کے موافق۔

بنگلور میں چار مہینے رہنے کے بعد امجدؔ سے ماں کی دوری سہی نہ گئی' چناں چہ وہ اپنے وطن واپس چلے آئے۔ یہاں آپ کے سامنے پھر وہی روزگار کا مسئلہ تھا۔ ان دنوں حیدرآباد میں مولوی عزیز مرزا صاحب' بی۔ اے کی شہرت کو سن کر امجدؔ ان سے ملاقات کو پہنچے۔ اس وقت تک امجدؔ کی رباعیات کافی مقبول ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اپنی رباعیات کی ایک جلد عزیز مرزا صاحب کو پیش کی۔ اس وقت امجدؔ کی عمر کم تھی' عزیز صاحب نے سمجھا کہ مولوی امجدؔ نے کسی لڑکے کے ہاتھوں سے اپنی تصنیف بھجوائی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شاعر امجدؔ کوئی بزرگ آدمی ہوں گے۔ چنانچہ رباعیاتِ امجدؔ کی جلد لانے والا اس کتاب کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس دلچسپ واقعہ کو امجدؔ نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے۔

> '' مولوی صاحب (عزیز مرزا صاحب) نے کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا' کیا مولوی امجدؔ صاحب نے بھیجی ہے ؟ ــــــــ ہم نے مسکرا کر عرض کیا' جی ہاں' یہ کتاب بھی امجدؔ ہی نے بھیجی ہے اور پیش کرنے والا بھی امجدؔ ہی ہے۔ مولوی صاحب ہماری صورت دیکھ کر متحیر ہوئے۔ پھر پوچھا؟ کیا یہ وہی

رباعیاں ہیں جن کے متعلق مولانا حالیؔ نے لکھا ہے کہ ''تعجب
ہے کہ تعلیم علمی کے زمانہ میں جو منافی شعر وسخن ہے ایسا عمدہ اور
اعلیٰ مذاق شاعری کا کیوں کر پیدا ہو۔'' ہم نے کہا' ہاں یہ وہی
رباعیاں ہیں''۔

(جمالِ امجدؔ، ص: ۸۸۔۸۷)

اس کے بعد مولوی عزیز صاحب امجدؔ کے حال پر مہربان ہو گئے۔ چنانچہ ان ہی کی سفارش پر امجدؔ مدرسۂ دارالعلوم میں ۲۰ روپیے ماہوار معاوضہ پر مدرس ہو گئے۔ اس طرح ذریعۂ معاش کا مسئلہ بہ آسانی حل ہو گیا۔ بعد ازاں انہوں نے ایک مکان بھی خرید لیا۔ اسی دوران آپ کو دفتر محاسبی میں بطور تھرڈ گریڈ اہل کار کے ملازمت مل گئی۔ تھرڈ گریڈ سے سیکنڈ گریڈ اور بعد میں فرسٹ گریڈ پر ترقی کی۔ فرسٹ گریڈ سے ترقی کر کے مددگار صدرِ محاسب ہوئے۔ اور اسی عہدہ پر وظیفہ سے سبک دوش ہوئے۔

طغیانی رودِ موسیٰ کا حادثہ:

مدرسہ دارالعلوم کی ملازمت کے دوران جو مکان امجدؔ نے خریدا تھا' وہ موسیٰ ندی کے قریب واقع تھا۔ ابھی نئے گھر میں داخل ہوئے ایک ماہ ہی گزرا تھا۔ کہ ماہ ستمبر ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں طغیانی آئی' جو آج بھی حیدرآباد کی تباہیوں اور ہولناکیوں کی وجہ سے یاد کی جاتی ہے۔ اس طغیانی میں لاتعداد لوگ تباہ بر باد ہو گئے۔ سینکڑوں ڈوب گئے۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ اس وقت امجدؔ کا خاندان چار اشخاص یعنی امجدؔ' والدہ' اہلیہ اور لڑکی پر مشتمل تھا۔ رات کے اندھیرے میں سیلاب شروع ہوا اور دن چڑھتے چڑھتے امجدؔ کی ماں' بیوی اور بیٹی ان کی آنکھوں کے سامنے نذرِ سیلاب ہو گئیں۔ امجدؔ کو اس طغیانی سے بچ نکلنے کا بہت رنج تھا۔ اپنے آپ سے خفا ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' بے غیرت کی بلا دور' ننگِ خاندان۔ خاندان کو ڈبو کر'

عزیزوں کو کھو کر ننگے دھڑ نگے' بھیانک صورت' ڈراونا چہرہ لیے جل مانس بنے ہوئے پھر کنارے تو لگ گئے ۔ بہنے والے بہہ گئے ۔ ڈوبنے والے ڈوب گئے اور ایسے گئے کہ لاشوں تک کا پتہ نہ چلا۔''

سیلاب میں جسم زار گو یا خس تھا
غرقاب محیطِ غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجدؔ
غیرت والے کو ایک چلّو بس تھا

(جمالِ امجدؔ ۔ ۱۰۰)

اس حادثہ نے امجدؔ کے قلب وجگر پر گہرا اثر ڈالا جو امجدؔ کے کلام میں درد والم اور سوز وگداز بن کر ظاہر ہوا ۔ اس دردناک حادثہ کو امجدؔ نے ایک نظم ''قیامتِ صغریٰ'' میں بڑے الم ناک انداز میں پیش کیا ہے ۔ یہ موثر تخلیق آپ کی تصنیف ''ریاضِ امجدؔ'' کے حصہ اوّل میں موجود ہے ۔

عقدِ ثانی:

حضرت امجدؔ رودِ موسیٰ کے حادثہ سے بچ نکلنے کے بعد ایک درویش کی طرح رہنے لگے ۔ آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے ۔ اور اس کی پہچان کے لیے بے چین رہنے لگے ۔ برسوں کی جستجو کے بعد بھی انہیں کوئی ایسا رہنما نہ ملا جو زندگی اور موت کے راز کو بتلاتا اور ذاتِ حق کا پتہ دیتا ۔ لکھتے ہیں:

''اور برسوں اسی فکر میں لگے رہے ۔ صبح ہوتی رہی ، شام ہوتی رہی ، عمر کے دن گذرتے ہی چلے گئے ۔ لیکن کوئی ایسا عامل کامل

نہ ملا کہ موت کے آسان ہونے کے لئے کوئی گنڈہ یا تعویز لکھ دیتا
یا نزع کی تکلیف نہ ہونے کا اطمینان دلا سکتا۔''

(جمال امجد ۱۰۶)

اس زمانے میں آپ سید صابر حسینی اور ان کے والد کے گھر پر رہا کرتے تھے' جو آپ سے نہایت عزت اور محبت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں آپ مولوی حکیم سید نادرالدین صاحب سے تحصیلِ علم کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب آپ کے اخلاق اور اوصافِ حمیدہ سے متاثر ہوکر اپنی بڑی بیٹی جمال النساء سے امجد کا عقدِ ثانی ۲۵/ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ بہ روز جمعہ کر دیا۔ انہوں نے بہ وقت رخصتی اپنی بیٹی کا ہاتھ امجد کے ہاتھ میں دے کر یوں کہا:

''بیٹا اس شخص کو ساری دنیا سے منتخب کر کے آج تمہارے حوالے
کرتا ہوں۔ خدا تم دونوں کو اپنی اور حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی محبت عطا فرمائے''

(جمال امجد، ص:۱۰۵)

حضرت امجد کا دوسرا عقد رودِ موسیٰ کے طغیانی کے چھ سال بعد ہوا تھا۔ شادی کے وقت جمال النساء کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ بعد نکاح کے حضرت امجد نے اپنی بیوی کا نام سلمیٰ رکھ لیا اور بعد میں جمالِ سلمیٰ۔ حکیم صاحب کو چوں کہ اپنی بیٹی سے خاص محبت تھی' اس لئے انہوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص دلچسپی دکھائی تھی۔

شادی کے ایک سال بعد اپنے خسر مولوی حکیم نادرالدین صاحب کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے ان کے سارے خاندان کا بار حضرت امجد پر آ پڑا۔ آپ کی انیس روپیہ ماہوار تنخواہ میں پورے خاندان کا گزران بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔

شادی کے پانچ چھ برس کے بعد آپ کی زندگی کا دور بدلنے لگا۔ ایک مرتبہ آپ

کی اہلیہ جمالِ سلمٰی لذتِ کشف سے دوچار ہوئیں ۔ دن بہ دن ان کی اس کیفیت میں اضافہ ہوتا گیا' جس کا خود امجدؔ کی زندگی پر خوش گوار اثر ہونے لگا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

"شادی کے پانچ' چھ برس تک تو ہماری زندگی معمولی زندگی رہی اس مدت میں کوئی خاص بات خاص طور پر قابلِ ذکر نہیں ہے۔ پانچ' چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کے دور بدلنے لگے ۔ نہ کہیں جانے کی ضرورت ہوئی نہ آنے کی ۔ وقت آ گیا' رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلتے گئے ۔ مولانا مرحوم کی دعا کا اثر شروع ہو گیا۔ خدا اور رسول کی محبت کے آثار سلمٰی کے اوصاف و اطوار سے ظاہر ہونے لگے۔ سرو سینے میں دل و دماغ کے دبے ہوئے بیج ایک طاقتور پودے کی طرح بھبکنے لگے۔ غیر معمولی دور بینی' دقیقہ رسی' ذہانت' ادراک' غور وفکر کا ملکہ ترقی کرتا چلا ۔ دماغ کی مخفی لہروں میں بڑھتے بڑھتے سمندر کی سی طوفان خیز' حیرت انگیز طاقت پیدا ہوتی چلی ۔ منہ سے جو بات نکلتی' عجیب ہوتی ' جو گفتگو ہوتی حیرت خیز ہوتی ۔ وہ کہنے کے لئے تھیں' ہم سمجھنے کے لئے تھے ۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب' ہمارا تعجب ان کی انبساط کا موجب ہوتا تھا۔"

(جمالِ امجد۔۱۰۹)

اس طرح حضرت امجدؔ کی زندگی اپنی دوسری رفیقۂ حیات کے ساتھ دنیا سے زیادہ دین کی فضا میں گزرنے لگی اور معرفت کے کئی رموز ان پر آشکارا ہونے لگے۔ جمالِ سلمٰی امجدؔ کی ہادی ہوگئیں اور امجدؔ بحیثیت شوہر مرشد تھے' خود مرید ہو گئے ۔ نیز میاں بیوی کی زندگی خوش وخرم گزرنے لگی۔ شوہر بیوی کا خیال اور ناز برداری کرتے ہیں تو بیوی شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کو افضل سمجھتی تھیں۔ دونوں اُنس و محبت اور مسرت آمیز

زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت امجدؔ نے عقدِ محبت'' کے عنوان پر لکھی یہ رباعی ملاحظہ ہو' جس سے آپ کی اور جمالِ سلمٰی کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دو دل اک ہوں تو نخلِ جاں پھلتا ہے
دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے
امجدؔ ! بجلی کی روشنی کی مانند
دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اوّل، ص:۴۲)

۱۳۴۵ھ میں حضرت امجدؔ نے اپنی اہلیہ جمالِ سلمٰی کے ساتھ حج کا سفر کیا۔ حج سے واپسی کے دو سال کے بعد ۱۳۴۷ھ میں جمالِ سلمٰی کا انتقال ہو گیا۔ حضرت امجدؔ کی زندگی کا یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا' جس سے وہ پھر ایک بار بھری دنیا میں اکیلے ہو گئے۔ دوستوں کے اسرار کے بعد تیسرا نکاح کیا، مگر جلد ہی اپنی تیسری بیوی کو طلاق دے دی۔ اور پھر ۱۳۴۹ء میں حضرت امجدؔ نے چوتھی شادی سید ابراہیم حسینی صاحب کی لڑکی قمر النساء بیگم سے کی۔ جو اوسط درجہ کی پڑھی لکھی اور صوم و صلوٰۃ کی سخت پابند خاتون تھیں، خوش اخلاق اور ملنسار تھیں۔ اس لئے دونوں کی زندگی پُرمسرت اور خوش گوار گزری۔ ان کی یہ اہلیہ حضرت امجدؔ کی وفات کے بعد بھی عرصہ تک بقیدِ حیات رہیں۔

جہاں تک اولاد کا سوال ہے' حضرت امجدؔ کو اپنی پہلی بیوی سے صرف ایک لڑکی ہوئی تھی' جو رودِ موسیٰ کی طغیانی میں نذرِ آب ہو گئی۔ باقی تینوں بیویوں سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ چناں چہ انہوں نے اپنی سالی کی ایک لڑکی کی پرورش کی اور اس کی شادی بھی کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور بچہ کی پرورش، اپنے حقیقی بچہّ کی طرح کی۔

سلسلۂ بعیت:

حضرت امجدؔ نے بچپن میں حضرت شمس الدین فیضیؔ دہلوی سے بعیت کی تھی۔ بعد میں وہ اپنی دوسری بیوی جمالِ سلمٰی سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان ہی کو اپنا رہبر و ہادی بنالیا تھا۔ لکھتے ہیں:

> ''بعیت میں ہمارا سلسلہ حضرت شمس الدین فیضیؔ دہلوی علیہ الرحمہ سے ملتا ہے۔ اور یہ بھی بچپن کی بات ہے۔ جوانی میں زن مرید ہوئے۔''

(جمالِ امجد، ص: ۲۹۷،۲۹۶)

اس کے علاوہ ''جمالِ امجد'' کے آٹھویں اور نویں نوشتوں سے بھی یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے راہِ سلوک طے کرنے کے لئے جمالِ سلمٰی کی رہنمائی حاصل کی تھی۔

اعزازات:

حضرت امجدؔ کی شہرت روز بہ روز سارے ہندوستان میں عام ہوتی رہی۔ آپ کی صوفیانہ رباعیات کے باعث آپ کو سرمدِ ثانی کہا جانے لگا تھا۔ آپ کی شاعرانہ عظمت و حکمت کا احترام کرتے ہوئے ۱۹۳۳ء میں رسالہ ''معارف'' کی جانب سے آپ کو ''حکیم الشعراء'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

حضرت امجدؔ، حیدرآباد کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کو قبولیت عام کی سند ان کی زندگی ہی میں مل گئی تھی۔ حیدرآباد کے ادارۂ ادبیاتِ اردو نے ان کی قدر دانی کا شاندار اہتمام کیا اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو حضرت امجدؔ کی چہل سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں حیدرآباد کے سٹی کالج میں جشنِ الماس منایا گیا۔ اس تاریخی جلسہ کی

صدارت افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق نے کی تھی، جس میں حیدرآباد اور ہندوستان کے دیگر مشہور ادیب وشعراء نے شرکت کی تھی ۔ ان میں جگرؔ مرادآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، عرشؔ ملسیانی، خواجہ حمیدالدین شاہدؔ نصیرالدین ہاشمی خیالیؔ، غیاثؔ صدیقی، ڈاکٹر جعفر حسن، فیاض الدین نظامیؔ کے نام اہم ہیں ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ حضرت امجدؔ نے اس کا جواب ''جوابِ سپاس نامہ'' دیا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ سٹی کالج وہیں بنایا گیا تھا، جہاں رودِ موسیٰ کی طغیانی میں حضرت امجدؔ کا سارا خاندان نذرِ آب ہوا تھا۔ اس کا ذکر حضرت امجدؔ نے ''جواب سپاس نامہ'' میں یوں پیش کیا ہے:

> ''یہ عجیب بات ہے کہ ۱۳۲۶ھ کی طغیانی میں امجدؔ اور اس کا خاندان جس جگہ غرق ہوا تھا، آج اسی جگہ اور اسی مقام پر امجدؔ کی جبلی منائی جارہی ہے۔''
>
> (ارمغانِ امجدؔ ۔ ۷۵)

جشنِ الماس کے دوسرے دن ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے حضرت امجدؔ اور ان کی اہلیہ قمرالنساء کو اپنے ساتھ مدراس لے گئے ۔ وہاں حضرت امجدؔ نے مختلف مشاعروں اور جلسوں میں شرکت فرمائی ۔ ڈاکٹر عبدالحق نے مدراس میں آپ کا ان الفاظ میں تعارف کروایا۔

> ''مجھ سے ملنے کے لئے آج تک جتنے حضرات بھی مدراس آئے، مجھے اپنا بزرگ سمجھ کر آئے، لیکن اس مرتبہ میرے بزرگ تشریف لائے ہیں۔''
>
> (حیات امجدؔ، ص:۳۳)

۱۹۵۸ء میں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے آپ کی شاندار ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر پانچ سو روپیے پیش کئے گئے۔

حضرت امجؔد کی بلند پایہ شاعری کی عظمت و بزرگی کا احترام کرتے ہوئے آپ کے اسمِ گرامی کو ''حکیم الشعراء حضرت امجؔد حسین امجؔد حیدر آبادی'' رحمتہ اللہ علیہ سے علمی وادبی دنیا میں یاد کیا جانے لگا۔

وفات:

حضرت امجؔد کی وفات بروزِ چہار شنبہ ۲۹/ مارچ ۱۹۶۱ء میں بہ مقام حیدر آباد دکن میں ہوئی۔ وفات کے دو تین دِن قبل آپ جاڑے کے بخار سے پریشان تھے۔ اس پریشانی کے عالم میں بھی آپ نے نماز وتلاوتِ قرآن کے عمل کو جاری رکھا۔ چہار شنبہ کے دن آپ کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ سینہ میں درد بڑھنے پر علاج کروایا گیا۔ مگر کچھ سدھار نہ آیا۔ بیماری کے اس عالمِ جاں میں آپ کی زبان سے غالؔب کا یہ شعر بار بار نکل رہا تھا۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنا گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

آپ یہ شعر پڑھتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ لحہ بہ لحہ آپ کی طبیعت بگڑتی گئی۔ رات نو بجے ڈاکٹر کو پھر سے بلوا کر انجکشن لگوایا گیا۔ مگر طبیعت نہیں سنبھلی۔ بدن سے پسینے جاری ہونے لگے۔ پسینہ صاف کر کے دودھ پلا کر لٹا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد رات ساڑھے دس بجے آپ کو زور کی ایک ہچکی لگی۔ اسی کے ساتھ آپ کی روح اس دارِ فانی سے پرواز کر گئی۔

اردو کے اس صاحبِ عرفان اور صوفی منش شاعر کی وفات کی خبر سارے حیدر آباد میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ صبح کے اخبارات میں آپ کی رحلت کی خبر شائع ہوئی جن سے حیدر آباد کی ساری فضا پر رنج وغم کے بادل چھا گئے۔ لوگ حضرت امجؔد کے

گھر زیارت کے لئے پہنچنے لگے ۔ جنازہ کے جلوس میں شہر کی معزز ہستیاں' شاعروں' ادیبوں' عالموں' مشائقین' اربابِ صحافت' آپ کے چاہنے والے ہزاروں لوگ شریک تھے ۔ جنازہ نام پلی کی ٹیک مسجد کو لے جایا گیا ۔ حیدر آباد کی ایک صاحبِ دل بزرگ ہستی حضرت عبداللہ شاہ صاحب نے جنازہ کی نماز پڑھائی ۔ دوپہر کے تین بجے درگاہ حضرت شاہ خاموشؒ کے شہر خموشاں میں اپنی اہلیہ جمالِ سلمٰی کے قبر کے پہلو میں (جہاں آپ نے پہلے ہی سے قبر تیار کرلی تھی) دفن کئے گئے ۔ وفات کے وقت حضرت امجدؔ کی عمر پچھتر (۷۵) سال کی تھی ۔

۴ ۔ سیرت و شخصیت :

حضرت امجدؔ کی خودنوشت '' جمالِ امجد '' اور سفرِ حج کے سفر نامہ '' حج امجدؔ '' سے آپ کی شخصیت پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے ۔ علاوہ ازیں آپ پر لکھے گئے مضامین اور خود آپ کے کلام سے آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو ظاہر ہوتے ہیں ۔ جن کا لب لباب یہ ہے کہ آپ ایک صوفی باعمل' دردمند انسان' خوددار' سادگی پسند اور خدارسیدہ بزرگ تھے ۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ قدرت جس سے بڑا کام لینا چاہتی ہے تو انہیں بچپن ہی میں ماں یا باپ کے سایہ سے محروم کردیتی ہے ۔ اس کے نتیجہ میں انہیں دنیا میں جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں' اس کی وجہ سے ان کے دل دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ نرم' حساس' اور دردمند ہوجاتے ہیں ۔ حضرت امجدؔ کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے ۔ آپ محض چالیس دن ہی کے تھے کہ یتیم ہوگئے ۔ بیوہ ماں کی گود میں آپ کی پرورش بڑے لاڈ و پیار سے ہوئی ۔ بچپن میں آپ کافی شریر تھے ۔ کم عمری میں شریر ہونا بعد کی عمر میں سنجیدہ ہونے کی علامت ہے ۔ رودِ موسیٰ طغیانی کے حادثہ کے بعد آپ کی سنجیدگی نے درویشی کا روپ اختیار کرلیا ۔ حضرت جمالِ سلمٰی سے عقد کے بعد آپ تاعمر ایک سچے صوفی بنے رہے ۔

حضرت امجدؔ جب دارالعلوم میں مدرس تھے' وہ ایک اچھے استاد ثابت ہوئے۔ اس وقت کے عام طریقہ کے برخلاف آپ طلبا کو مارتے نہیں تھے۔ بلکہ شفقت اور محبت سے تعلیم دیتے تھے۔ جولڑکے ذہین اور تعلیم سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ ان کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ حالاں کہ حضرت امجدؔ کو اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران سخت سے سخت گیر اساتذہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مہمان نوازی آپ کا وصفِ خاص تھا۔ آپ کے ملنے والوں کا ایک سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آپ بصد خوشی ان کی مہمان نوازی کیا کرتے تھے۔ کبھی پیشانی پر بل نہ آنے دیتے تھے۔

نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''آپ (حضرت امجدؔ) بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہفتوں اور مہینوں مہمان آپ کے یہاں رہا کرتے۔''

(ارمغانِ امجدؔ، ص:۱۳)

حضرت امجدؔ بڑے خودار شخص تھے۔ کبھی کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے تھے۔ خود دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی حیات میں خدا کے علاوہ کسی کی آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ جبکہ حیدرآباد کی بڑی سے بڑی ہستیاں جیسے' سر اکبر حیدری مرحوم' سر امین جنگ مرحوم' مہدی یار جنگ مرحوم وغیرہ جیسے وزرائے اعظم سے آپ کے دوستانہ مراسم تھے۔ بعض عہدہ دار آپ کے عقیدت مند بھی تھے۔ لیکن حضرت امجدؔ نے کبھی کسی سے اپنے لئے کچھ مانگا نہ کوئی درخواست کی۔ ان کی تلقین یہ تھی۔

ہر چیز مسببِ سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو

کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم ص:۳)

سادگی وانکساری حضرت امجدؔ کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ آپ کی غذا سادہ تھی ، لباس بھی بالکل معمولی استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنا کام خود کیا کرتے تھے۔ جب آپ سیکنڈ گریڈ کلرک تھے تو روزانہ اپنی سائکل کو کندھے پر لادکر دفتر کی سیڑھیاں چڑھا کرتے تھے۔ کبھی آپ نے چپراسی کو سائکل اٹھانے کی زحمت نہ دی۔ دارلعلوم کی مدرسی سے آپ ترقی کرتے کرتے مددگار صدرِ محاسبی کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ تاہم آپ کے اندر غرور پیدا ہوا نہ آپ کے مزاج میں کوئی بدلاؤ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سادگی اور انکساری آپ کے فطری اوصاف ہیں۔ اور آپ کو اس پر ناز تھا۔ لکھتے ہیں:

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی
میں اپنی نیستی پہ مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری
تنز ل میں ترقی کررہا ہوں (گلستانِ امجد، ص:۱۰۹)

حضرت امجدؔ اپنے ملازمین کو نوکر نہیں بلکہ اپنے برابر کا انسان سمجھتے تھے۔ جو وہ کھاتے تھے وہی انہیں کھلاتے تھے۔ ان کے ساتھ نرمی سے پیش آتے اور ان کی غلطیوں کو اکثر معاف کردیا کرتے۔ دوستوں اور مہمانوں میں مشغول رہنے کے باوجود وہ نوکروں کو نہیں بھلاتے تھے۔ ان ہی اوصاف کی وجہ سے ملازم آپ کے یہاں برسوں رہتے تھے۔ معتقدین اور مریدین کے ساتھ بھی، آپ کا سلوک سارے زمانہ سے الگ تھا۔ آپ مریدوں سے خدمت نہیں لیا کرتے بلکہ خود آپ ان کی خدمت کیا کرتے۔

حضرت امجدؔ اپنی شاعرانہ عظمت و بزرگی کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مقبول و معروف ہو گئے تھے۔اس کے باوجود انہوں نے گوشہ نشینی کو ترجیح دی تھی۔وہ ہمیشہ نام و نمود سے پرہیز کرتے رہے۔انھیں خودنمائی اور خودستائی بالکل پسند نہ تھی مشاعروں اور تقریبوں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے۔وہ خودنمائی کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔فرماتے ہیں:

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت ! تم سے دیا سلائی اچھی

(رباعیاتِ امجد،حصہ اوّل،ص:۲۰)

حضرت امجدؔ مصنوعی عبادات اور دکھاوے کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔جو لوگ دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں ان کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

پرداخت نہ کی تو نے کماہی دل کی
دیکھی نہ کبھی ذرا تباہی دل کی
اے زاہد خود بیں ! یہ نہیں داغِ سجود
پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

(پیامِ امجدؔ ،ص:۱۵۹)

حضرت امجدؔ انسانی فطرت کے نباض تھے۔ غرور و تکبر انسان کے وہ منفی صفات ہیں، جس سے انسان دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور غفلت میں رہتا ہے۔ایک کم ظرف آدمی

ذراسی عزت اور دولت کو پا کر اترانے لگتا ہے۔ جب کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا غرور جلد ہی ٹوٹنے والا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اس منفی پہلو کو حضرت امجدؔ نے اپنی رباعی میں یوں پیش کیا ہے:

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر وخیس
تنکا تھوڑی ہوا میں اڑ جاتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اوّل، ص: ۴۴)

حضرت امجدؔ ایک فلسفی ہی نہیں ایک صوفی با عمل بھی تھے۔ انہیں تلاشِ حق ہمیشہ سرگرداں رکھتی تھی۔ آپ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہر وقت انسان، زندگی اور کائنات کے متعلق غور وفکر میں محو رہتے تھے۔ ازل سے یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر مفکر اپنی کھوج کرتا ہے۔ اور کائنات کے رازِ پائے سربستہ کو جاننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ غور وفکر کی ان منزلوں کو حضرت امجدؔ نے یوں بیان کیا ہے:

بہت سونچا سمجھ میں کچھ نہ آیا مجھے کس نے بنا یا کیوں بنایا

عدم میں کس مزے سے سو رہا تھا مجھے کس نے جگا یا کیوں جگا یا
بہت دور ایک کونے میں پڑا تھا یہاں کس نے بلایا کیوں بلایا
پھر آخر اس بھری محفل میں امجدؔ مجھے کس نے اٹھا یا کیوں اٹھا یا
اس آنے جانے کا کیا ماحصل ہے
بہت سونچا سمجھ میں کچھ نہ آیا

ریاضِ امجد، حصہ اوّل، ص:۳۲)

اس کش مکش سے آپ کو اس وقت چھٹکارا ملا جب آپ نے زندگی کے مقصد کو جان لیا۔ آپ کے نزدیک جستجوئے مقصود ہی زندگی کا مقصد ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر وقت ہے لب پہ گفتگوئے مقصود
لیکن نظر آتا نہیں روئے مقصود
کیا تم کو بتاؤں زندگی کا مقصد
مقصدِ زیست، جستجوئے مقصود

(رباعیاتِ امجدؔ حصہ دوم، ص:۶۲)

خدا کو پالینا ہی آپ کا مقصدِ حیات تھا۔ اور آپ نے یہ جان لیا تھا کہ وہ خدا ہی ہے جو ساری کائنات کا خالق ہے۔ اور اسی کے حکم سے ہر شئے اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو
فضائے بحر وبر کیا دیکھتے ہو
کسی کی حکم سے سب ہو رہا ہے
اِدھر دیکھو اُدھر کیا دیکھتے ہو

(رباعیاتِ امجدؔ حصہ سوم، ص:۱۰۱)

حضرت امجدؔ اعلیٰ انسانی اقدار و اخلاق کے مالک تھے۔ جو کوئی آپ سے ملتا آپ کا ہو جاتا۔ آپ کے ملنے والوں میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ امیر ہو یا غریب' اعلیٰ ہو یا ادنی' مرد ہو یا عورت آپ سب سے یکساں طور پر ملتے تھے۔ ملنے والے کے عہدے' مرتبے یا اس کی امارت کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ سب سے محبت و شفقت سے ملا

کرتے۔ ملنے والا ان سے مل کر ضرور خوش اور مطمئن ہوتا۔ ہر شخص یہی سوچتا کہ وہ اس پر مہربان ہیں۔ اس طرح وہ ادنیٰ واعلیٰ سب کو اپنی شخصیت سے متاثر کرتے تھے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

''حضرت امجدؔ جتنے بڑے شاعر تھے' اتنے ہی بڑے انسان تھے۔ اور یہی وہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کی شخصیت اور اندازِ گفتگو میں ایسی مقناطیسی کشش تھی' جو بھی ایک آدھ دفعہ ان سے مل لیتا' وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاتا تھا۔''

(امجدؔ نمبر۔ ص:۲۸)

ہر انسان کو خوش دیکھنا ہی حضرت امجدؔ کی دلی خواہش تھی۔ اسی لئے اپنے اس خیال کو یوں عارفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں:

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تحمید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

(گلستانِ امجدؔ ص:۵۶)

حضرت امجدؔ کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی کو رنج پہنچانا سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ کعبہ ڈھانے کو گناہ نہیں سمجھتے بلکہ کعبۂ دل کو ڈھانا جرمِ عظیم سمجھتے ہیں۔

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیض متصل کو توڑا

کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے

افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

(رباعیاتِ امجدؔ حصہ سوم،ص: ۴۴)

حضرت امجدؔ ایک صوفی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ایک صوفی خاندان میں ہوئی تھی۔ مذہب، اخلاق، تصوف اور عرفان آپ کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ عمر کے ساتھ یہ جذبات بڑھتے گئے اور کلام کے ذریعہ ظاہر ہونے لگے۔ اسی لئے ان کے کلام میں عشق کی سچی لگن، روحانیت اور صداقت موجود ہے۔ ایک سچے صوفی کی پہچان یہی ہے کہ وہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کی وحدانیت کو دیکھتا ہے۔ حضرت امجدؔ فرماتے ہیں۔:

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو

ہر بُت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو

اعداد تمام مختلف ہیں باہم

ہر ایک میں ہے اکائی دیکھو

(رباعیاتِ امجدؔ حصہ اول،ص: ۳۰)

کائنات کی ہر شئے خدا کی ذات وصفات کی مظہر ہے۔ یہ انسانی آنکھ کی کمزوری ہے کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتی ہے۔ صوفی، کائنات کی مثالوں سے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ عام انسان بھی خدا کی پوشیدہ ذات کو محسوس کر سکے اور سمجھ سکے۔ اس خیال کی وضاحت میں حضرت امجدؔ کی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے۔

صفت تیری ہر خار دکھا دیتا ہے

ہر غنچہ و گل صدا دیتا ہے

ہر اصل اصولِ معرفت ہے یا رب
پتہ' پتہ ' تیرا پتہ دیتا ہے

(امجد نمبر،ص:۵۹)

یہ اور اس طرح کی کئی رباعیات ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ایک صوفی مزاج بزرگ تھے۔نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

''امجد صاحب ایک شاعر تھے اس کے ساتھ ایک صوفی بھی' شاعر اور صوفی کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہر صوفی شاعر نہیں ہوتا اور نہ ہر شاعر صوفی ہوتا ہے۔شاعر تخیل کی نگرانی میں رہنے والا' افکار کی بوقلمونی میں حیران شعر کی دھن میں رہنے والا' مبالغے کی دنیا میں بسنے والا ہوتا ہے۔اور صوفی اللہ سے دل لگاتا ہے۔ذاتِ وحدۃ لاشریک کی یاد میں مگن رہنے والا' ہر حق پر عمل کرنے والا ہوتا ہے۔امجد صاحب دونوں تھے۔شاعر بھی اور صوفی بھی۔۔۔۔۔آپ کی شاعری سے بخوبی واضح ہوتا ہے' ان کا خالق شاعری کے ساتھ بڑا صوفی بڑا سالک ہے۔

(امجد نمبر۔ص:۱۴۱)

حضرت امجد کو ایک صوفی اور درویش سمجھ کر دنیا کی زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔صوفی سے پہلے وہ ایک انسان ہیں' ان کا ایک گھر ہے' اہل وعیال ہیں۔چوں کہ شوہر و بیوی کے تعلقات سب سے زیادہ قریبی ہوتے ہیں' اس لئے ایک مرد کی شخصیت پر سب سے بہترین تبصرہ اس کی بیوی ہی کر سکتی ہے۔

حضرت امجد کی ازدواجی زندگی پر اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ایک کے بعد دیگر چار شادیاں کی تھیں۔آپ کی پہلی بیوی شادی کے چار سال کے بعد رودِ موسیٰ کی طغیانی میں چل بسیں۔اس لئے ان کے تعلقات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

آپ کی دوسری بیوی جمالِ سلمٰی چودہ سال تک آپ کے دکھ سکھ کی ساتھی رہیں۔ اس باب کے حصہ "عقدِ ثانی" میں اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ آپ اپنی بیوی سے کس قدر متاثر تھے۔ غرض ان کے ساتھ آپ کی زندگی خوش وخرم اور خوش گوار گزری تھی۔

جمالِ سلمٰی کے انتقال کے بعد آپ نے تیسرا نکاح کیا۔ تیسری بیوی سے آپ کی نبھ نہیں سکی۔ چناں چہ آپ نے انہیں طلاق دے دی۔ بعد ازاں چوتھی شادی قمر النساء بیگم سے کی جو آپ کی وفات کے بعد عرصہ تک بقید حیات رہیں۔ ان کی یہ اہلیہ باسلیقہ، خوش اخلاق، ملنسار اور شوہر کی فرماں بردار تھیں۔ حضرت امجدؔ بھی ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپ ان میں جمالِ سلمٰی کی مشابہت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ لکھتے ہیں:

> "ہمارا عقد بغیر کسی سعی و کوشش کے قدرتی طور پر ایک ایسی خاتون سے ہوگیا جو شکلاً صورتاً عادتاً انھیں (جمالِ سلمٰی) کی مماثل تھیں۔ وہ رام پوری تھیں یہ حیدر آبادی ہیں۔ ہم صورتی اور مشابہت ظاہری بھی اس درجہ ہے کہ بعض دیکھنے والے ابتداً نئی بیوی کو دیکھ کر کہہ اٹھے۔ "ارے یہ تو وہی پرانی جمالِ سلمٰی ہے جس کے مرنے کی غلط خبر اڑائی گئی۔"

(جمالِ امجد۔ ص:۲۸۹)

غرض حضرت امجدؔ اپنے گھر والوں کے لئے بہترین رفیق، سچے ہمدرد اور مہربان واقع ہوئے تھے۔

حضرت امجدؔ بڑے متقی اور پرہیز گار آدمی تھے۔ زیارتِ حج کے بعد آپ کی روحانی تقویت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ نماز کے پابند تھے اور اکثر نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ فرض نمازوں کے علاوہ تہجد اور نوافل کا بھی اہتمام کرتے اور ذکر وفکر میں

مشغول رہتے ۔ آپ کو قرأت کلام اللہ سے بہت لگاؤ تھا۔ اکثر وہ بڑے شوق سے قرأت سماعت فرماتے اور سر دھنتے رہتے ۔ قوالی کا بھی آپ کو بڑا شوق تھا۔ اکثر قوالی میں شریک ہوتے اور بڑے ذوق وشوق سے سماعت فرماتے ۔ مجلس سماع سے آپ کو خاص لگاؤ تھا۔ اس طرح کی مجلسوں میں آپ تڑپنے اور لوٹتے نہیں البتہ رولیا کرتے تھے۔ سگریٹ کثرت سے پیا کرتے اور کہا کرتے کہ یہ میرا پچاس' ساٹھ سال کا ساتھی ہے۔

حضرت امجدؔ کی غذا سادہ تھی ۔ کسی خاص قسم کی غذا سے رغبت نہیں رکھتے تھے ۔ اس خصوص میں آپ کا خیال تھا کہ'' جو مل گیا سو کھانا داتا کا نام جپنا''۔ آپ لباس بھی معمولی پہنا کرتے' البتہ ہمیشہ پاک وصاف کپڑے پہنتے تھے ۔ آپ کے لباس میں سفید یا خاکستر شیروانی ہوتی ۔ پہلے آپ ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے ۔ حج کے بعد عربی وضع کی کپڑے کی ٹوپی استعمال کرنے لگے۔ پہلے سلیم شاہی جوتا اور پھر چپل بھی پہننے لگے تھے۔

حضرت امجدؔ کا رنگ اور خد وخال کا ذکر انہیں کی زبانی ملاحظہ کیجئے' جس میں آپ نے اشارتاً اپنی خاکساری کا اظہار کیا ہے:

> '' ہمارا رنگ گندمی ہے ۔ وہ گندم جس کی بدولت بابا آدم جنت سے دنیا میں اور ہمارے بابا دنیا سے جنت میں بھیجے گئے ۔ قد دو گز سے دو انچ کم ۔ سر بڑا استری کا آدھا نمبر' فراخ پیشانی' بھوں آنکھ کان'' متوسط نہ بڑے چھوٹے'' رخسار کسی قدر دبے ہوئے مختصر سی داڑھی' نور وظلمت کا نمونہ' سینہ چوڑا' کمر سینے سے ۵ انچ کم' جسم موٹا نہ دبلا' مذبذب بین ذالک قوئ ابتدائی جوانی سے اب تک ایک حال پر بال برابر فرق نہیں' اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو پتھر ہم سے اس وقت نہیں اٹھ سکتا تھا اب بھی اسی طرح نہیں اٹھ سکتا۔''

(جمالِ امجدؔ ۔ ص:۲۹۲)

غرض حضرت امجدؔ کی شخصیت کی سادگی و بزرگی سے لوگ اس قدر متاثر تھے کہ وہ اپنی پریشانیوں اور حاجتوں کا ذکر ان سے کیا کرتے تھے۔ آپ کبھی کسی کو پانی دم کر کے دیتے ہیں تو کبھی کسی کو تعویذ دے رہے ہیں۔ حضرت امجدؔ خاص خاص لوگوں کو مرید بھی بناتے تھے۔ اور وہ اپنے مریدوں سے برابر والوں کا سلوک کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مرید مرشد کا دوست ہوتا ہے۔

اختتامیہ:

حضرت امجدؔ ۱۳۰۳ھ م ۱۸۸۶ء میں دکن حیدرآباد کے ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید احمد حسین تھا۔ ولادت کے چالیس دن بعد آپ یتیم ہوگئے۔ لاچار بیوہ ماں نے اپنے بیٹے کی پرورش، تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ حیدرآباد کے اسلامی مدرسہ جامعہ نظامیہ میں داخل کروائے گئے۔ جہاں آپ نے چھ سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد کہیں بھی آپ کی باقاعدہ تعلیم نہیں ہوئی۔

سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کی پہلی شادی ہوئی۔ کسی خانگی وجہ سے بنگلور چلا گئے۔ وہاں چار مہینے مختلف جگہوں پر مدرسی کی۔ پھر واپس حیدرآباد آکر مدرسہ دارالعلوم میں مدرس ہوگئے۔

۱۹۰۸ء کے طغیانی رودِ موسیٰ میں آپ کا سارا خاندان، ماں، بیوی، اور بیٹی آپ کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آب ہوگئے۔ اس حادثہ کا آپ کے قلب و جگر پر ایسا اثر ہوا کہ آپ عام زندگی کے معاملات سے الگ تھلگ ہو کر ایک درویش کی سی زندگی جینے لگے۔

چھ سال کے بعد آپ کا دوسرا عقدِ جمال النساء (جمالِ سلمیٰ) سے ہوا۔ آپ کی

پ کی زندگی میں نورِ معرفت کی بارش ہونے لگی۔ جمالِ سلمیٰ کی علم باطنی سے آپ بے حد متاثر ہوئے اور ان سے تاعمر فیض پاتے رہے۔ حضرت امجدؔ کی زندگی میں جمالِ سلمیٰ ایک بیوی کے علاوہ ایک رہنما کا مقام بھی رکھتی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ خود کو ''زن مرید'' کہنے لگے تھے۔ حضرت امجدؔ نے اسی اہلیہ کے ساتھ حج کا سفر کیا تھا۔ حج سے واپسی کے بعد جمالِ سلمیٰ کے انتقال سے امجدؔ پھر ایک مرتبہ تنہا ہو گئے۔ دوستوں کے اصرار کے بعد تیسری شادی کی مگر جلد ہی طلاق دے دی۔ چوتھی شادی قمر النساء سے کی جو جمالِ سلمیٰ کی صورت و سیرت سے مشابہت رکھتی تھیں۔ اس اہلیہ سے آپ کی زندگی پُر مسرت اور خوش گوار گزری جو آپ کے وفات کے بعد بھی بقیدِ حیات رہیں۔ حضرت امجدؔ کو اپنی پہلی بیوی سے ایک لڑکی ہوئی جو رودِ موسیٰ طغیانی میں بہہ گئی۔ باقی تینوں بیویوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

ایک طرف حضرت امجدؔ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں رسالہ معارف کی جانب سے حکیم الشعراء کے خطاب سے نوازا گیا' تو دوسری طرف آپ کی صوفیانہ رباعیات کے باعث آپ کو سرمدِ ثانی کہا جانے لگا۔ ۱۹۵۵ء میں آپ کی چہل سالہ ادبی خدمات پر جشنِ الماس منایا گیا' جس میں ملک کے مشہور و معروف ادیب و شعراء نے شرکت کی۔ جلسہ کے تقریباً چھ سال بعد ۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء میں آپ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ بہ وقت وفات آپ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔

حضرت امجدؔ ایک مثالی انسان تھے۔ آپ کی زندگی ابتداء ہی سے آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرتی رہی' اور آپ ہر آزمائش میں کامیاب ہوتے رہے۔ انہوں نے نہ کبھی زمانہ کی شکایت کی اور نہ کبھی خدا سے شکوہ کیا۔ آپ کے یہی اوصاف آپ کو خدا ترس اور صوفی ثابت کرتے ہیں۔

حضرت امجدؔ ایک اچھے استاد ثابت ہوئے۔ جو طلبہ کو محبت و شفقت سے تعلیم دیا

کرتے تھے۔ آپ کی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ مہمان ہفتوں مہینوں آپ کے گھر میں رہا کرتے تھے۔ اکثر آپ دوسروں کی مدد کرتے' مگر وہ خود کسی کا احسان گوارا نہ کرتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ میں تکبّر و گھمنڈ تھا۔ اس کے برعکس آپ میں سادگی اور انکساری موجود تھی۔ آپ کی غذا' لباس گفتگو' یہاں تک کہ آپ کے کلام سے بھی سادگی ظاہر ہوتی ہے ۔آپ اپنے ملازمین کو نوکر نہیں بلکہ اپنے برابر کا انسان سمجھتے تھے۔ اور مریدوں کو دوست۔

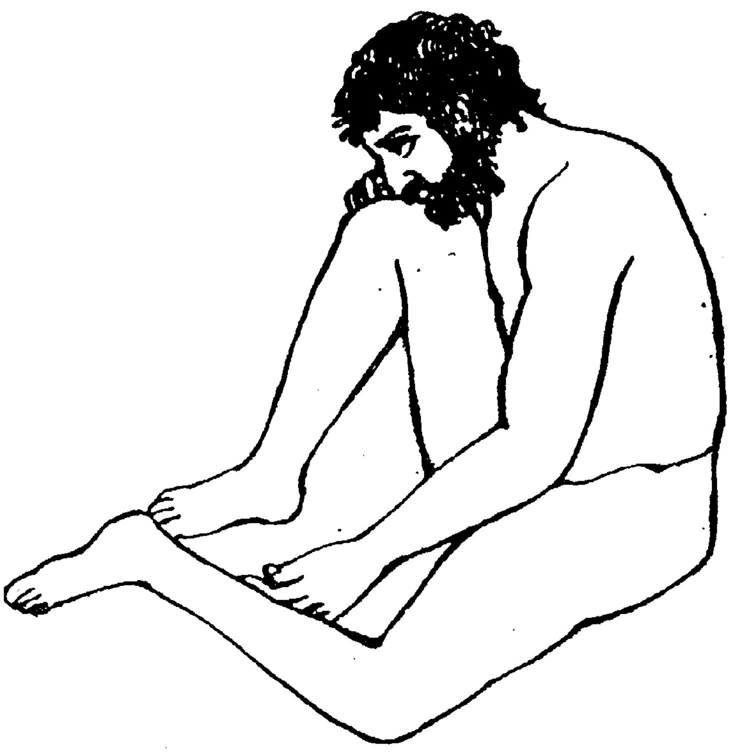
حضرت امجدؔ کو مال ومتاع' نام ونمود کی بالکل خواہش نہ تھی ۔ خود نمائی اور خودستائی سے پرہیز کرتے تھے۔ آپ ایک گوشہ نشین قسم کے بزرگ تھے' اور ہر وقت غور وفکر میں مبتلا رہتے ۔ فطرتِ انسانی پر آپ کی نظر گہری تھی ۔ انسانیت اور انسان دوستی کا جذبہ آپ کی سیرت وشخصیت سے نمایاں ہوتا ہے ۔ آپ میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جو اک آدھ بار آپ سے مل لیتا وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا ہو جاتا۔ آپ سب سے یکساں طور پر ملتے' اور چھوٹے بڑے کا، امیر غریب اور اپنے پرائے کا امتیاز نہ کرتے تھے۔

حضرت امجدؔ ایک سچے صوفی تھے ۔ ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کی عظمت وبزرگی کو دیکھ لیتے ہیں۔ خدا کو پالینا ہی آپ کی زندگی کا اہم مقصد رہا ہے۔ اور یہی ایک صوفی کی پہچان بھی ہے۔

عہد امجدؔ (۱۹۶۱ء تا ۱۸۸۶ء) میں شہر حیدرآباد میں کئی طرح کی سیاسی تحریکیں اور تنظیمیں ہوتی رہیں ۔ مگر آپ ایک صوفی منش تھے' کسی تحریک کی حمایت کی نہ مخالفت اور نہ کسی تحریک میں حصہ لیا۔ اس طرح آپ ہر طرح کی سیاسی وانقلابی سرگرمیوں سے دور رہے۔

آپ کے دور میں اردو زبان وادب کو کافی فروغ حاصل ہوا ایک طرف اردو سرکاری زبان قرار پائی' تو دوسری طرف ادب میں نئے رجحانات داخل ہونے لگے۔ ایک

طرف روایتی ادب کو مقبولیت حاصل تھی، تو دوسری طرف ترقی پسند ادب روز بہ روز ترقی کی منزلیں طئے کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں دکنی ادب کی مقبولیت بھی قائم رہی۔ تاہم حضرت امجد نے اپنی شاعری کی ایک الگ پہچان بنائی۔ انہوں نے اخلاقیات اور روحانی تعلیمات کو لطیف اور موثر انداز میں ادا کر کے ادب میں قابل قدر مقام حاصل کیا۔



ویمنا
(۱۶۵۰ء-۱۷۵۰ء)

باب دوم

ویمناؔ:

عہد، زندگی اور شخصیت

۱۔ عہد ویمنا:

ویمنا یا ویمنا یا وے منّا تلگو کا مشہور عوامی شاعر گزرا ہے۔ بیسویں صدی تک تلگو ادیبوں نے اسے ایک یوگی سمجھ رکھا تھا۔ لیکن جب اسکی شاعری عوام میں مقبول ہونے لگی تو انھوں نے ویمنا پر تحقیق کرنی شروع کی ۔ اور اسے ایک شاعر کی حثیت سے پہچانا۔ اس وقت تک ویمنا کی زندگی اور اسکا عہد وقت کے اندھیرے میں گم رہا۔ لوگ اسکے تعلق سے طرح طرح کی من گھڑت کہانیاں کہا کرتے تھے' جو تاریخی اعتبار سے کمزور ثابت ہوئیں اور جو حقیقت سے دور تھیں۔

ویمنا کے عہد کے تعلق سے جو قابلِ ذکر تحقیق کی گئی ہے ان میں سب سے پہلے مغربی اسکالروں کے نام آتے ہیں۔ دراصل انہوں نے ہی ویمنا کی شاعری' زندگی اور اسکے عہد کے تعلق سے پہلے پہل مواد فراہم کیا تھا۔ ان محققوں میں سی. پی. براؤن کا نام سرِ فہرست ہے۔ موصوف مدراس سول سروس کے رکن تھے اور انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ویمنا پر تحقیقی کام کیا تھا۔

مغربی اسکالروں کی آراء:

مغربی ادیبوں میں ویمنا کے تعلق سے مختصر طور پر لکھنے والا اوّلین مصنف فرانسی پادری' جے. اے. ابے دوبائی [J.A.ABBE DUBIOU] تھا۔ جس نے ۱۷۹۲ء سے ۱۸۲۳ء تک ہندوستان کے علاقۂ مدراس میں اپنی زندگی گذاری تھی۔ دوبائی نے ۱۸۰۶ء میں ''ہندوؤں کے رسم و رواج اور عیدیں'' نامی ایک کتاب فرانسی زبان میں اس مقصد سے لکھی تھی کہ مغربی افسران اسے پڑھ کر ہندو تہذیب سے واقفیت حاصل کریں۔ ۱۸۸۷ء میں ہنری کے بیوکامپ [Henry k. Bevkemp] نے اس کتاب کا انگریزی

میں بعنوان Hindu Manners , Customs and ceremonies ترجمہ کیا۔

دوبائی نے ویمنا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ لوگوں کی زبانی ویمنا کے پدس کر بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے ویمنا کی تاریخ پیدائش ووفات کے تعلق سے تحریر کیا ہے۔

" we are told that the philosopher who was of the Reddy Caste and was born in the distict of Cuddappah , died towards the end of the seventeenth century " [Hindu man-- P-194]

ترجمہ:

''ہم نے سنا تھا کہ ایک فلسفی' جو ریڈی ذات کا تھا' ضلع کڈپہ میں پیدا ہوا تھا اور سترہویں صدی کے اواخر میں اس کی وفات ہوئی تھی۔''

(ہندو۔۔۔۔ص:۱۹۴)

ابے دوبائی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ویمنا کا دور ۱۶۰۰ء سے ۱۷۰۰ء کا درمیانی دور تھا۔

ویمنا کے عہد کے تعلق سے مغربی اسکالروں میں سی. پی. براؤن کا نام سب سے اہم ہے۔ ۱۸۱۶ء میں براؤن سول سروس کے ایک رکن کی حیثیت سے مدراس آیا تھا۔ براؤن کو ویمنا کا تعارف ابے دوبائی کی کتاب سے ہوا۔ وہ اسکی شاعری کو پڑھ کر اسکا شیدائی بن گیا۔ پھر وہ ویمنا کے پدوں کو اکھٹا کرنے لگا۔ تقریباً اٹھارہ (۱۸) سال ویمنا کی شاعری کا مسلسل مطالعہ کرنے کے بعد براؤن عہدِ ویمنا کے تعلق سے یوں قیاس کرتا ہے۔

" It is said that in a verse he has fixed the date of birth which is believed to have been

his own . this date coincides with A.D. 1652. The date is given in the cycle of sixty years. But which cycle is intended is unknown. Many verses, however , prove satisfactory that he wrote in the later part of the seventeenth century when the Mohemmadans were the governors of that part of India " [My Discovery of vemana,]

(بحوالہ پرجا کوی ویمنا، ص: ۲۶)

ترجمہ:

''یہ کہا جاتا ہے کہ اس (ویمنا) نے ایک پد میں اپنی تاریخی ولادت بتائی ہے۔ یہ تاریخ سن ۱۶۵۲ء ہوسکتی ہے۔ تاہم یہ سال ہر ساٹھ برس میں دھرانے کی وجہ سے صدی کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ویمنا کے کئی پدوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سترہویں صدی کے اواخر کا شاعر تھا۔ اور اس وقت مسلمان اس علاقہ پر حکمران تھے۔''

براؤن کا خیال ہے کہ ویمنا نے اپنے ایک پد میں اپنی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ جن کی بنیاد پر اس سنِ پیدائش ۱۶۵۲ء قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس تاریخ کو پورے یقین کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ پد کے مطابق نندن سال[1] ہر ساٹھ (۶۰) سال کے بعد آتا ہے۔ چناں چہ نندن سال ۱۵۹۲ء یا ۱۶۵۲ء یا ۱۷۱۲ء وغیرہ ہوسکتا ہے۔ براؤن نے ۱۶۵۲ء کو ترجیح دی ہے۔ اس خصوص میں براؤن کا دوسرا خیال یہ ہے کہ ویمنا کے دور میں اس علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت تھی' یہ درست ہے۔

(۱۔ نندن سال: یہ ہندوؤں کا وہ سال ہے جو ساٹھ سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔)

ویمنا کے پدوں میں فارسی اور ترکی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مکاّ یعنی مکہؑ ،گلاّ مُ یعنی غلام؛ تورُکا یعنی ترک؛ مالُو یعنی محل وغیرہ۔ اور براؤن کا کہنا ہے کہ سترھویں صدی کے آخر میں اس علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت تھی جہاں ویمنا رہتا تھا۔

ویمنا کے دور کے تعلق سے اے دوبائی اور براؤن کی تاریخوں میں ۳۰۔تا ۴۰ سال کا فرق ہے۔ ۱۸۷۱ء میں سی .وی .گوور نے اپنی کتاب folk songs of south India میں ویمنا کے دور کے تعلق سے طویل بحث کی ہے' اسکا کہنا ہے کہ ویمنا بارھویں صدی کا شاعر ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ گوور تامل کے مشہور شاعر تروولوٗ ور سے بے حد متاثر تھا۔ ویمنا کی شاعری کے موضوعات اور تروولوٗ ور کے موضوعات میں یکسانیت ہونے کی وجہ سے وہ ویمنا سے بھی متاثر تھا۔ گوور کا کہنا ہے کہ بارھویں صدی میں ویمنا پر تامل شاعری کا اثر پڑا اور وہ بھی ان ہی موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کرنے لگا۔ ویمنا بھی اسی دور کا شاعر ہے۔

تلگو اور تامل دو مختلف زبانیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ویمنا نے تامل شاعری کا اثر قبول کیا ہو۔ اگر کیا بھی ہو تو صرف انسانی اور فطری موضوعات کی بنا پر کسی شاعر کا عہد طئے کرنا ایک کمزور دلیل ہے۔

۱۸۹۸ء میں کامپ بل نے ویمنا پر ایک عمدہ مضمون شائع کیا تھا۔ موصوف کے مطابق اس کی اور براؤن کی تاریخیں میل کھاتی ہیں۔ کامپ بل سترہ سال (۱۷) سال آندھرا کے رائل سیما علاقہ میں رہا اور اس نے ویمنا کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ کامپ بل نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔

"History is a unknown art in India and it is extremely difficult to discover a basis of

reliable fact beneath the mass of legends
which are associated with the name of the
poet . It is generally believed that he
lived about 250 years ago .

(Essay:"The one great poet of the people ". P-68)

(بحوالہ پرجا کوی ویمنا، ص: ۶۸)

ترجمہ:

''ہندستان فن تاریخ سے آگاہ نہیں ہے۔ ویما کے متعلق عوام میں بولی جانے والی مختلف من گھڑت کہانیوں سے اس کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل کام ہے۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ وہ ۲۵۰ برس پہلے کا شاعر تھا۔''

یعنی کامپ بل کے مطابق ویما کا دور تقریباً ۱۶۴۰ء کا ہے۔

چناں چہ گوور کے علاوہ ابے دوبائی' براؤن اور کامپ بل نے عہدِ ویما کو ۱۶۵۰ء۔۱۷۵۰ء کا درمیانی دور قرار دیا ہے۔ ان تینوں میں سب سے قدیم خیال ابے دوبائی کا ہے' جس نے کسی سے سُن کر عہدِ ویما کا تعین کیا تھا۔ براؤن نے کافی تحقیق کے بعد ویما کی تاریخ پیدائش ۱۶۵۲ء متعین کی ہے۔ کامپ بل نے براؤن کے اس خیال کی تائید کی۔ اس سے ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ مغربی اسکالروں کی اکثریت براؤن کے خیال سے متفق ہے۔ جس کے مطابق ویما کا دور سترھویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔

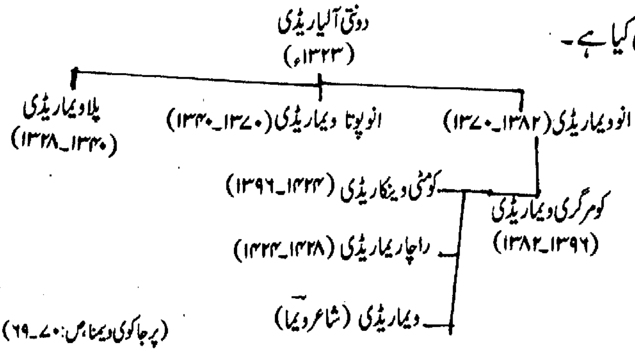
تلگوادیبوں کی آراء:

براؤن نے ویما پر کافی محنت کرنے کے بعد ۱۸۲۹ء میں ویما کے چند پدوں کا انگریزی میں ترجمہ کرکے Verses of Vemana Moral , religious and

satirical کے عنوان سے شائع کیا۔ اسکے باوجود تلگو کے ادیبوں کو تقریباً سو (۱۰۰) سال تک ویمنا کا خیال نہ آیا۔ جبکہ ویمنا کی شاعری عوام میں زندہ وتابندہ رہی۔ تلگو زبان سے واقف تقریباً ہر شخص ویمنا کے پدوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں دہراتا رہا۔ تب کہیں جا کر تلگو ادیبوں نے ویمنا کی شاعری پر غور کرنا شروع کیا۔ اسکے ساتھ ہی ویمنا پر تحقیقی کام دوبارہ شروع ہوگیا۔

عہدِ ویمنا کے تعلق سے لکھتے ہوئے ۱۹۱۲ء میں پورنیہ چاری نے اپنی کتاب ویمنا یوگیندرا چرترمو (یوگی ویمنا کی تاریخ) میں لکھتا ہے کہ ۱۳۲۸ء - ۱۴۲۸ء تک جو ریڈی راجاؤں نے کنڈا ویڈو علاقہ پر راج کیا تھا' اسی خاندان میں ویمنا پیدا ہوا جسکا نام ویمار یڈی تھا۔ یہ کومرگری ویمار یڈی ۱۳۹۶ء-۱۳۸۲ء اور ملا ماما کا تیسرا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ویمنا کے سب سے بڑے بھائی کومٹی ویناکار یڈی نے (۱۴۲۴-۱۳۹۶) تک حکومت کی۔ اس کے بعد دوسرے بھائی راچا ویمار یڈی نے (۱۴۲۸-۱۴۲۴) تک حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ ویمنا ابھی نوعمر ہی تھا کہ انکی حکومت ختم ہوگئی۔ چناں چہ پورنیہ چاری کا خیال ہے کہ ویمنا پندرھویں صدی کا شاعر ہے۔

پورنیہ چاری کی تحقیق کی بنیاد پر ایک اور تلگو مصنف گوپی نے ویمنا کا یہ شجرہ بنایا ہے۔ گوپی نے اپنی کتاب پر جا کوی ویمنا (عوامی شاعر ویمنا) میں اس شجرہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔



(پرجاکوی ویمنا ص: ۷۰-۶۹)

تاہم اس کے برعکس کومراجو لکشمن راؤ نے شجرۂ ھذا اور تواریخ مذکورہ پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کومر گری ریڈی نے ۱۳۹۰ء سے ۱۴۰۰ء تک حکومت کی تھی اور اسکی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے بڑے بھائی ماچنا کے پوتے کومٹی ویمار یڈی حکومت سونپ دی، جس نے ۱۴۲۰ء۔۱۴۰۰ء تک حکومت کی۔ کومٹی ویمار یڈی کے بعد اسکے بیٹے راچا ویمار یڈی ۱۴۲۴ء۔۱۴۲۰ء تک حکومت کی، جو کنڈ اویڈو کا آخری راجہ تھا۔ چناں چہ پورنیہ چاری کا یہ کہنا کہ کومر گری ریڈی نے ۱۳۹۶ء۔۱۳۸۲ء حکومت کی تھی' یا اسکے تین بیٹے تھے' جسمیں تیسرا بیٹا ویمنا تھا غلط ثابت ہوتا ہے۔ لکشمن راؤ کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر ویمنا پندرھویں صدی کا شاعر تھا تو ویرشیو کے شاعرں نے ویمنا کو کیوں نہیں سراہا جوان ہی کے مذہب کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ (ایضاً، ص:۱۷)

سیشا دری ورمن شاعران نے بھی پورنیہ چاری کے خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ویمنا کٹھار پلی کا متوطن تھا۔ کٹھار پلی صوبۂ آندھرا پردیش کے علاقۂ رائل سیما کے جنوبی ضلع انت پور کے تعلقہ کدری کے مشرق میں ۷ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اور یہاں کے ریڈیوں کو پا کا ریڈی کہا جاتا ہے۔ ویمنا کا شمار بھی پا کا ریڈیوں میں ہوتا ہے۔ اگر پورنیہ چاری کے خیال کو مان لیا جائے تو ویمنا پا کا ریڈی نہیں ہوسکتا' کیوں کہ اس کا تعلق کنڈ اویڈو سے بتایا گیا اور وہاں کے رہنے والے ریڈیوں کو پا کا ریڈی نہیں بلکہ پنٹا ریڈی کہا جاتا ہے۔ لہذا پورنیہ چاری کا خیال صحیح نہیں ہوسکتا۔

(دیباچہ: ویمنا پدیا مولو، ص:۳)

ویمنا کے عہد کے تعلق سے تحقیق کرنے والوں میں ونگوری سبا راؤ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے چودھویں اور پندرھویں صدی کے تلگو شعراء کے کلام میں ویمنا کے ذکر کو ڈھونڈنے کی خام کوشش کر کے' اس کے عہد کو ۱۵۰۰ء۔۱۴۰۰ء کے درمیانی دور قرار دیا ہے۔

سُبّاراؤ کا کہنا ہے کہ کرشنا رائل کے زمانہ کا شاعر یرّا پر گڈا نے اپنے کلام میں دیگر ویرشیو کے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے۔ ''ویمو'' نامی شاعر کا بھی ذکر کیا ہے انکا کہنا ہے کہ ویماؔ اور ویمو ایک ہی ہیں۔(ویما یوگیندرا چرترا، ص: ۳۳)

اس پر اعتراض کرتے ہوئے بنڈارو تمیا لکھتے ہیں کہ لفظ ویمو سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ویماؔ ہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور ویرشیو کا شاعر ہے جس کا ذکر تاریخ میں نہیں ہے۔

سبّاراؤ نے ایک اور شاعر ٹرا گا راما کوی کے کلام کا حوالہ دیا ہے جس میں دیگر شعراء کے ساتھ ویمو نامی شاعر کا بھی ذکر موجود ہے۔ مگر اس پر بھی تمیاّ نے اعتراض کیا ہے کہ ٹرا گا رامہ کوی نے جن شعراء کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے وہ سب سنسکرت کے ویرشیو شاعر ہیں' ان میں جو ویمو ہے وہ ویماؔ نہیں ہے۔(پرجا کوی ویمنا، ص: ۸۲تا ۸۰)

نارلہ وینکٹسورراؤ بھی سبّاراؤ کی مذکورہ دلیلوں کو پختہ نہیں مانا ہے انکا کہنا ہے کہ بیسویں صدی تک ویماؔ کو تلگو ادیبوں نے اہمیت نہیں دی تھی۔ ایسے میں یہ ماننا مشکل ہے کہ پندرھویں صدی کے شعراء یرّا پرگڈا اور ٹرا گا رامہ کوی ویماؔ کو اپنی شاعری میں عزت بخشی ہوگی۔ چناں چہ وہ اپنی انگریزی کتاب ''ویمنا'' میں لکھتے ہیں۔

" He (Vanguri Subba Rao) also makes much of certain references to "Vema " made by others medieval poets.This evidence is hardly sustainable . It is , as we have seen , only from middle of the second decade of the twentieth century that vemana is being taken notice of the world of Telugu scholarship ; earlier he was either

ignored or dismissed out of hand as no poet at all . Such being the case , no old poet and much less , scholarly poets like Turagarama kavi and Erra pragada , could have Conceivably referred to vemana with respect.

(Vemana - page no -33).

ترجمہ:

''وی۔ لیں۔ راؤ نے وسطی دور کے شاعروں کے حوالوں سے ویما کا ذکر کیا ہے۔ یہ حوالے نا قابلِ یقین ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ موجودہ صدی (بیسویں صدی) کے دوسرے دھائی ہی سے تلگو محققوں نے ویما کو بطور شاعر دیکھا تھا۔ اس سے پہلے ویما بحیثیتِ شاعر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں یہ ماننا مشکل ہے کہ تلگو کے قدیم شعرا یا پھر یرّ ا پرا گڈا اور تورا گا راما کوی جیسے عام شاعر ویما کو اپنی شاعری میں عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتے ہوں۔''

بنڈارو تمیا نے ویما کے عہد کو ویما کی شاعری میں تلاش کرنے کی کوش کی ہے۔ انہوں نے ویما کے پدوں میں مذکورہ راجاؤں کے حوالے سے ویما کو ۱۷۵۰-۱۶۵۰ کے درمیانی دور کا شاعر قرار دیا ہے۔ تاہم انکے حوالوں میں ابہام وتضاد پایا جاتا ہے۔ جیسے ویما نے "رائینی بھاسکر" کی سخاوت کا ذکر اپنے ایک پد میں کیا ہے مگر سبّا راؤ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ رائنی بھاسکر نامی کئی راجہ ہیں جو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ویما نے جس کی تعریف کی ہے وہ اسکا ہم عصر ہی ہو۔ تمیا خود اپنی اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں دکھائی دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ویما کے عہد کے تعلق سے نکلنے والے سارے راستے مبہم ہیں۔
مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرا خیال صحیح ہے۔''

(ویمنا کالمو۔آندھراپترکا۔ص:۷۷۔)

ویما کے پدوں میں فارسی الفاظ کا استعمال:

۱۶۰۰ء میں وجے نگر کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد مسلمان حکمران دکن پر غالب رہے۔اس وقت ہندوؤں پر جو زیادتیاں ہوئیں' اس پر ویمانے مسلمانوں کے خلاف جو پد لکھے ہیں' ان میں فارسی الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔علاوہ ازیں کچھ دوسرے پدوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ دیکھے جاسکتے ہیں۔مثلاً

ترک — తిరుపతికి పోవ తురక దాసరి కాడు

مکہ — మక్కాకు పోనేల మరి తిరిగి రానేల

محل — మాళ్ళు నూళ్ళు కలిగి మనిరి వేమ

غلام — కూలి నాలి చేసి గుల్లాము పని చేసి

اللہ محمد — అన్నిట పరిపూర్ణ డల్లా మహమ్మదు

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ویما دکن پر مسلم حکمرانوں کے دور میں موجود تھا۔

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مغربی اسکالرروں میں گوور کے علاوہ دوبائی' براؤن اور کامپ بل نے ویما کے دور کو ۱۶۵۰-۱۷۵۰ کا درمیانی دور قرار دیا ہے۔ان میں سب سے قدیم خیال دوبائی کا ہے۔جنہوں نے ۱۸۰۶ء میں کسی سے سن کر ویما کے دور کا تعین کیا تھا۔براؤن نے ویما پر کافی تحقیق کی اور اسکے پدوں کے ذریعہ طے کیا کہ

ویمنا کی تاریخِ پیدائش لگ بھگ ۱۶۵۲ء ہے۔ کامپ بل نے براؤن کے اس خیال کی تائید کی ہے۔

تلگو محققین ویمنا کے عہد کو طئے کرنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ پورنیہ چاری نے ویمنا کے خاندان کا شجرہ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ پندرھویں صدی کا شاعر تھا۔ جبکہ کومرگری لکشمن راؤ نے اس شجرہ اور تاریخ کو غلط ثابت کیا ہے۔ سباّ راؤ نے ویمنا کے دور کو ۱۵۰۰۔۱۴۰۰ء کا دور قرار دیا ہے۔ تاہم جن حوالوں کا انہوں نے سہارا لیا ہے وہ کمزور ہیں۔ تمیاّ نے ویمنا پر کافی تحقیق کی اور اس کے دور کو قیاساً ۱۷۵۰۔۱۶۵۰ ٹھہرایا۔

لسانی اعتبار سے ویمنا کے پدوں میں مخصوص فارسی الفاظ کا پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانہ میں اس علاقہ پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ جو سولھویں صدی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

اس سے ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ویمنا کا دور ۱۷۵۰۔۱۶۵۰ کا درمیانی دور ہوا ہوگا۔

ویمنا کی جائے پیدائش:

ویمنا کے وطن کے تعلق سے سب سے پہلے براؤن نے تحقیق کی۔ اس نے کرنول، گنٹور، کڈپہ ضلعوں میں جا کر تحقیق کی، مگر اسے کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا۔ اس لئے اس نے ویمنا کی زبان کا لسانی تجزیہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ویمنا کا تعلق تلنگانہ کے مغربی جنوب کے علاقہ سے ہو سکتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

" I have had opportunities of inquring at all these places and have , after all , gained no information

whatever - yet this dialect in a few passages render it probable that vemana was a native of the south - western of Telangana where these towns are situated.

(preface to vemana-verses of vemana-1829)

ترجمہ:

''مجھے ان علاقوں کی تفتیش کرنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ان کا حاصل کچھ نہ نکلا۔ اُس (ویمنّا) کی بول چال زبان سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا وطن ان علاقوں میں سے ہے، جو تلنگانہ کے مغربی جنوب میں آباد ہیں۔''

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ رائل سیما کا رہنے والا تھا۔

میک ڈونالڈ نے براؤن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ویمنّا نے کئی الفاظ مخصوص معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ جن کا تعلق رائل سیما کی زبان سے ہے۔ جیسے ''پچا'' کے معنی ہیں پیلے رنگ کے، مگر رائل سیما میں اسے ''سونے'' (Gold) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ''وکاپڈو'' کے معنی ہیں روزہ (fasting) اور یہ لفظ صرف رائل سیما میں رائج ہے۔ جبکہ آندھرا کے دیگر علاقوں میں روزہ کو ''اپواسمو'' کہتے ہیں۔

(پرجا کوی ویمنا، ص:۹۳)

سبّاراؤ لکھتے ہیں کہ ویمنّا کے پدوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ

وہ علاقہء رائل سیما کا رہنے والا تھا۔ مثلاً تاراڈو (తారాడు) یعنی جھولنا، کویو (కూయు) یعنی چیخنا، دڈّو (డబ్బు) یعنی پیسہ؛ ولی کی (వల్లికి) یعنی قبرستان وغیرہ ایسے الفاظ ہیں

جوصرف رائل سیما میں بولے جاتے ہیں۔ (ویمنا ،ص:۱۴۱)

ویمنا کا ایک پد ہے جس میں اس نے اپنے وطن کے تعلق سے اشارہ دیا ہے۔ یہ دو نام ہیں۔کنڈاویڈواور موگا چنتا پلیّ۔تاہم یہ دونوں نام متنازعہ فیہہ ہیں۔موگا چنتا پلی قریہ کئی ضلعوں میں واقع ہے۔چناں چہ شسیادری رمن شاعران کا کہنا ہے کہ موگا چنتا پلی ضلع اُنگول میں ہے۔رالاّ پلیّ اننت کرشنا شرما کا خیال ہے کہ یہ قریہ ضلع کڈپہ میں ہے۔تمیاّ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ قریہ ضلع نیلور میں ہے۔تلگو کے مشہور ادیب وشاعر آردرا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ویمنا چندرگری کے آس پاس موگا چنتا پلی قریہ میں پیدا ہوا' کنڈاویڈو میں پروش پائی اور رائل سیما کے علاقوں میں پھرتا رہا۔نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ویمنا تاملناڈو کے علاقہ تن جاور میں بھی رہا ہے۔لہٰذا اس کے پدوں میں تامل کے ریت رواجوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔تامل ناڈو ہی نہیں بلکہ کرناٹک کے میسور میں بھی ویمنا رہا ہو۔یہ بات مشہور ہے کہ کنڑا کے مشہور شاعر سروگنیا سے اسکی ملاقات ہوئی تھی۔ (برجاکوی ویمنا ،ص:۹۹)

غرض مغربی اسکالروں اور تلگو محققین کی اکثریت کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ ویمنا آندھرا کے علاقہ رایل سیما کے کسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔

ویمنا کی ذات:

قبل ازیں پورنیہ چاری نے ویمنا کا شجرہ پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ویمنا کا تعلق ریڈی راجہ ذات سے تھا۔تاہم ویمنا نے اپنے پدوں میں خودکو ''کاپو' ذات کا فرد قرار دیا ہے۔'' کاپو' یعنی کسان یا مزدور۔ویمنا کے پدوں میں ایک غریب کسان کا درد محسوس ہوتا ہے۔ جوصرف ایک کسان ہی محسوس کرسکتا ہے۔دیہاتی زندگی کے حالات' قریوں کی آب وہوا کے علاوہ کسانوں کی مجبوریوں اور پریشانیوں کا موثر انداز میں ذکر ملتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ویمنا ایک عام کسان کے

خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اس نے دیہاتی زندگی کے تکالیف کو جھیلا ہے۔ اسکے پدوں کے یہ مصرع ملاحظہ کیجئے۔

۱ جو نہیں ہے قرض دار وہ سب سے بڑا مال دار (ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۷۹)

۲ اگر پیسہ نہیں ہے تو وہ نالائقوں میں شامل ہے (ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۸۹)

۳ جس کے پاس پیسہ نہیں ہے وہ چلتی پھرتی لاش ہے۔ ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۰۶)

۴ غریبی، شہرت، عزت، اور صداقت کو گھٹا دیتی ہے۔ ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۴۰)

وغیرہ

ویمؔا کی وفات:

ویمؔا کی وفات کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنے آخری دنوں میں کٹھار پلی، نزد شہر کدری، ضلع انت پور، رائل سیما میں تھا، وہیں اسکی وفات ہوئی اور وہیں وہ دفن بھی ہوا۔ لوگ آج بھی اس کی قبر کے پاس نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ تاہم شرما نے خود کٹھار پلی جا کر ویمؔا کے متعلق سے جانکاری حاصل کی تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی تنگا ویما ہے نہ کہ اصل ویما۔ انکا کہنا ہے کہ تنگا ویما بھی ایک شاعر تھا، جو ویمؔا کی طرح پد لکھا کرتا تھا۔ تنگا ویما نے ایک پد میں اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ جبکہ اس وقت تک ویما کی موت ہو چکی تھی۔ دوسرا ٹھوس ثبوت انہوں نے یہ دیا ہے کہ تنگا ویما اپنے پدوں کے چوتھے مصرعے میں ''بالا چکرا ویما بھویہ نامہ'' لکھا ہے، جبکہ ویمؔا پدوں کے چوتھا مصرع میں ''وسوادابھی راماونوراویما'' لکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ تنگا ویما کے تعلق سے جو کہانیاں کٹھاؔ رپلیؔ میں عام ہیں وہ ویمؔا کی زندگی سے میل

نہیں کھاتی ہیں۔ چناں چہ شرما کا کہنا ہے کہ ویما نے کٹھارپلّی میں وفات نہیں پائی بلکہ رائل سیما میں کسی اور جگہ وفات پائی ہے۔ (ویمنا۔ص:۷۷تا۸۰)

ویمؔا کی وفات کے تعلق سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ آدی شنکرا کی طرح غار میں جاکر زندہ دفن ہوگیا تھا۔ اوروہ غار کڈپہ ضلع کے پامورنامی گاؤں میں موجود ہے۔

ویمؔا کی وفات کے تعلق سے اس طرح کی کئی باتیں مشہور ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اسکی پیدائش کی طرح اس کی موت اور تدفین کے تعلق سے بھی کوئی بات ٹھوس دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہوسکی ہے۔ ایک وجہ اسکی یہ بھی ہے کہ وہ خودگم نامی چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شہرت کا قائل نہیں تھا اور وہ ظاہری پرستش کو بھی نہیں مانتا تھا۔ شاید ویمؔا جانتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اسکی قبر کی پوجا ہوگی۔ اس لئے اس نے اپنی پیدائش کی طرح اپنی موت کو بھی گم نامی کے اندھیرے میں ڈھکیل دیا ہو۔

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ویمؔا رائل سیما کا رہنے والا تھا۔ تاہم ویمؔا کی وفات کہاں اور کیسے ہوئی اسکی کوئی ٹھوس جانکاری کسی کو نہیں ہے۔ البتہ اتنا معلوم ہوا ہے کہ اس نے رائل سیما میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا ہے۔

سیاسی پس منظر:

مذکورہ بحث وتمحیص سے یہ طئے ہوگیا ہے کہ ویما کا دور ۱۶۵۰-۱۷۵۰ کا درمیانی دور تھا۔ یہ بھی طئے ہوگیا ہے کہ اس نے اپنی عمر کا سارا حصّہ آندھرا کے علاقۂ رائل سیما میں گزارا۔ لہٰذا اب سترھویں صدی کے رائل سیما کے سیاسی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ویمؔا کے دور کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

وجئے نگر کی حکومت کا زوال:

۱۵۶۵ء کی قیامت خیز جنگ تالی کوٹہ کے بعد وجے نگر کی حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔ یہ جنگ بہمنی سلطانوں اور وجے نگر کی سلطنت کے درمیان ہوئی تھی۔ جس میں وجے نگر کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جنگ کے بعد ترو ملا رائل وجے نگر سے سارے خزانوں کو لے کر پنکنڈہ چلا گیا اور ۱۵۶۸ء میں پنکنڈہ کو دارالسلطنت بنایا۔ ۱۵۷۰ء میں ترو ملا رائل نے اپنی حکومت کے تین بڑے حصّہ کر کے اپنے تین بیٹوں کو سونپ دیئے تا کہ عمدگی کے ساتھ حکومت چلائی جا سکے۔ وہ تین حصّہ اس طرح تھے۔

تلگو علاقہ (پنکنڈا دارالسلطنت) سری رنگا رائل کے لئے

کنڑا علاقہ (سری رنگا پٹنم دارالسلطنت) راما رائل کے لئے

دراوڑی علاقہ (چندرا گری دارالسلطنت) وینکٹ پتی رائل کے لئے

۱۵۷۲ء میں ترو ملا رائل کی وفات کے بعد سری رنگا رائل نے حکومت سنبھالی۔ اس کے عہد میں لگاتار بیجا پور اور گول کنڈہ کے نوابوں کے حملے ہوتے رہے۔ آہستہ آہستہ اس کی حکومت ختم ہوتی گئی۔ ۱۵۸۵ء میں سری رنگا رائل کی موت ہو جاتی ہے۔ ۱۵۸۵ء کے بعد وینکٹ پتی رائل نے چندرا گری کو مرکزی حکومت بنا کر حکومت کی ذمّہ داری اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس نے ۱۵۸۶ء سے ۱۶۱۱ء تک پورے ۲۸ سال حکومت کی اور آخر دم تک اپنی حکومت کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں جانے نہیں دیا۔ وینکٹ پتی رائل وجے نگر کا آخری قابلِ ذکر راجہ تھا۔ ۱۶۱۴ء میں وینکٹ پتی رائل کے وفات کے بعد علاقائی راجاؤں کے آپسی جھگڑوں سے اور مسلمانوں کے حملوں سے وجے نگر کی بچی کچی حکومت اور بھی کمزور ہو گئی۔ چناں چہ ۱۶۷۵ء تک وجے نگر کی حکومت پوری طرح

ختم ہوگئی۔

۱۶۴۶ء سے ۱۶۷۵ء تک رائل سیما میں سیاسی انتشار اپنے عروج پر تھا۔ کسی کی حکومت قائم نہیں رہتی تھی ۔ مسلمانوں کے لگا تار حملوں اور علاقائی راجاؤں کی آپسی لڑائیوں سے سیاسی بدامنی پھیل گئی تھی ۔ چناں چہ ۱۶۷۵ء سے ۱۸۰۰ء تک رائل سیما پر نوابوں اور علاقائی راجاؤں نے حکومت کی۔

ریاستِ وجے نگر کے ساتھ ساتھ اسکی پڑوسی ریاستوں تنجاور، مدورا اور گول کنڈہ کے سیاسی حالات کا اثر رائل سیما پر پڑا۔

تنجاور اور مدررا کی ریاستیں:

حکومتِ وجے نگر کے عروج کے دوران جنوب میں دو اور ریاستوں نے ترقی کی ۔ ایک تنجاور اور دوسری مدورا۔ یہ ریاستیں تامل علاقہ میں ہونے کے باوجود آندھرا کے وجے نگر کے راجاؤں کے زیرِ نگرانی تھیں ۔ تنجاور کا پہلا راجہ جیوپا نائیکڈو تھا۔ اس کا بیٹا اچیوتا نائیکڈو جب تخت نشیں ہوا تب تک وجے نگر کی حکومت زوال پذیر ہو چکی تھی ۔ جب اسکا بیٹا رگھوناتھ ۱۶۱۴ء میں راجہ ہوا، اسی سال وجے نگر کا آخری راجہ وینکٹ پتی رائل کی وفات ہوئی ۔ ۱۶۳۳ء میں رگھوناتھ کے بیٹے نے حکومت سنبھالی جو ایک نا اہل حکمراں تھا۔ گول کنڈہ اور بیجاپور کے نوابوں کے مسلسل حملوں سے وہ بالکل کمزور ہو گیا۔ ۱۶۶۲ء کے خطرناک قحط کی وجہ سے ریاست کے اقتصادی حالات اور بھی کمزور ہو گئے ۔ ۱۶۷۵ء میں مہاراشٹرا کے شواجی مہاراج کے بھائی ونکو جی راؤ نے تنجاور پر قبضہ کرلیا۔

مدورا پر تقریباً دو سو سال (۱۵۲۹-۱۷۳۶) تک آندھرا کے نائک راجاؤں نے حکومت کی ۔ اور مسلمان بادشاہوں کی مدد سے ریاستِ وجے نگر کو شکست دینے میں

کامیاب ہوئے۔ مدورا کا سب سے پہلا راجہ وسوا ناتھ نائک اور سب سے آخری حکمراں مینا کشی تھی۔ ۱۷۳۶ء کے مدورا پوری طرح مسلمانوں کے قبضہ میں چلا گیا۔

گول کنڈہ کی ریاست:

گول کنڈہ کے نوابوں نے تقریباً ۱۷۰ سال (۱۶۸۷۔۱۵۱۲) آندھرا پردیش پر حکومت کی تھی۔ یہ وہی دور تھا جب وجے نگر کے راجاؤں نے پنکنڈہ اور چندرگری کو مرکز بنا کر حکومت کیا کرتے تھے۔ ۱۵۶۵ء کی جنگ تالی کوٹہ میں وجے نگر کو شکست دینے میں گولکنڈہ کے تیسرے نواب ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰۔۱۵۵۰) نے اہم رول ادا کیا تھا۔ اس نے تلگو شاعروں کی بڑی عزت کی تھی۔ گول کنڈہ کا چوتھا نواب قلی قطب شاہ (۱۶۱۱۔۱۵۸۰) کے دور میں تقریباً سارا آندھرا پردیش ریاستِ گول کنڈہ کے ماتحت آگیا تھا۔ اسی نواب نے شہرِ حیدرآباد کو آباد کیا تھا۔ گول کنڈہ کا آخری نواب ابوالحسن قطب شاہ (تانا شاہ) (۱۶۸۷۔۱۶۷۲) تھا۔ مغل بادشاہ اورنگ زیب نے گول کنڈہ پر حملہ کیا اور تانا شاہ کو شکست دی۔ چناں چہ ۱۶۸۷ء میں گول کنڈہ کی حکومت ختم ہوگئی۔ حکومت کے خاتمہ کے بعد اورنگ زیب نے دکن پر بیس سال (۲۰) حکومت کی۔ تاہم وہ امن قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ مسلسل جنگوں کی وجہ سے حکومت کمزور ہوچکی تھی اور علاقائی راجاؤں اور زمیں داروں نے بغاوت کر دی تھی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام حکومت کا آغاز ہوا۔

رائل سیما کے سیاسی حالات:

۱۶۸۷ء تک کڈپہ پر نوابوں نے گول کنڈہ کے ماتحت حکومت کی تھی۔ میر جملہ گنڈی کوٹہ کے پہلے نواب کے طور پر تخت نشیں ہوا۔ اُدھر عبدالنبی خان کڈپہ کا پہلا نواب ہوا۔ یہ نواب اپنی ریاستوں میں امن قائم کرنے میں ناکام رہے۔ ۱۷۴۰ء میں مراٹھوں

نے کڈپہ پر حملہ کیا اور نواب کو شکست دی۔ بعدِ ازاں کڈپہ، کرنول اور آرکاٹ کے نوابوں نے مل کر مراٹھوں کو وہاں سے مار بھگایا۔

سولھویں صدی کے آخر میں، ضلع اننت پور کا ایک علاقہ گتی درگم ریاستِ گول کنڈا میں شامل کرلیا گیا۔ ۱۶۸۷ کے بعد اورنگ زیب نے دکن پر قبضہ کر کے اس ضلع کو دکن میں شامل کرلیا۔

۱۶۴۶ء میں ضلع چتور حکومتِ گول کنڈہ کی قبضہ میں آ گیا۔ اس ضلع کے چند علاقے جیسے مدن پلی، وائل پاڈ، پنگنور پر ریاستِ گول کنڈہ کے منتخب کڈپہ نوابوں نے حکومت کی تھی، اور باقی تعلقوں پر آرکاٹ کے نواب راج کیا کرتے تھے۔ ریاستِ گولکنڈہ کے خاتمہ کے بعد ۱۶۸۷ء سے اس ضلع پر کرناٹک کے نوابوں نے راج کیا۔

1, Andhrula charithra, Etukuri Balarama Murthy .

2. Andhrula charithra Sanskruthi, Khandapalle Lakshmi Tharanjani

3. Andhrula charithra, Suravaram Pratap Reddy .

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ ویما (۱۷۵۰-۱۶۵۰) میں آندھرا پردیش پر کسی کی حکومت مستقل طور پر قائم نہ رہ سکی تھی۔ لہذا رعایا ٹھیکے داروں، علاقائی راجاؤں، نوابوں اور زمین داروں وغیرہ سے پریشان تھی۔ ہر حکمراں کو اپنی حکومت چھن جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ اسے رعایا کی مطلق فکر نہ تھی۔ چناں چہ رائل سیما میں سیاسی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ ریاست اور رعایا دونوں سیاسی انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔

ویما کے پدوں میں سیاسی حالات:

ویما نے اپنے پدوں میں اپنے دور کی سیاسی حالات کو پیش کیا ہے۔ تاہم اس نے کسی حکمراں کا نام نہیں لیا ہے۔ ویما نے کھل کر اس دور کے راجاؤں پر تنقید کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے سیاسی حالات کا کیا رخ تھا۔

ویمؔا نے ایک پد میں اپنے عہد کے کسی راجہ کو بزدل اور نالائق قرار دیا ہے اور کہتا ہے۔

بزدل راجہ دشمن کی طاقت سے ڈر کر
اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگ رہا ہے
وہ یما (ملک الموت) کے غضب سے
کیسے بچ سکتا ہے۔

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۶۴)

نااہل راجاؤں کی حکومت کے تعلق سے ویمؔا کا خیال ہے۔

اگر نالائق کو حکومت سونپ دی جائے
تو وہ لائق لوگوں کو بھگا دیتا ہے
چپل چبانے والے کتے کو
گنے کا مزہ کیا معلوم

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۹۷)

ویمؔا کہتا ہے کہ راجہ سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ جب وہ ہمیں کاٹنا چاہتا ہے تو ہماری خدمت کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ہمیں ڈس لیتا ہے؛

راجاؤں کی چاہے تم کتنی ہی خدمت کرلو
وہ تمہارا بھلا نہیں کرتے
جیسے ایک سانپ سے دوستی اچھی نہیں ہوتی

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۱۱۲)

یہ اور ایسے کئی پد ویؔما کے ہاں مل جاتے ہیں۔اس نے راجاؤں پر تنقید ہی نہیں کی ہے۔ بلکہ ایک اچھے اور قابل راجہ کی تمنا بھی کی ہے' جو رعایا کی حفاظت کر سکتا ہے اور ان کا بھلا چاہتا ہے۔

زمین و آسمان کی اور
اس پورے سنسار کی حفاظت کرنے والا
راجہ کون ہے؟
انسان کو راجہ (مالک) کہنا ٹھیک نہیں ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۲۳)

جہاں کہیں ویؔما کی شاعری میں سیاسی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے سیاسی حالات بہتر نہیں تھے۔کوئی مرکزی حکومت قائم نہیں تھی۔حکومت قریوں میں بٹ چکی تھی۔ ہر ایک راجہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ ہر وقت نالائقوں کی جماعت میں گھرا رہتا تھا۔اس کو عوام کا مطلق خیال نہ تھا۔وہ بھی ایک عام انسان کی طرح کمزور رہتا تھا اور اسے ہر وقت اپنی حکومت کے لُٹ جانے کا خوف لگا رہتا تھا۔ویؔما نے راجاؤں پر کھل کر تنقید کی ہے۔انہیں کبھی نالائق کہا ہے' تو کبھی لٹیرا' کبھی سانپ تو کبھی بندر۔

سماجی پس منظر:

ویؔما کے دور کے سیاسی حالات کی ابتری کی وجہ سے سماج میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ چونکہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی' اس لئے کہیں امن وشانتی کا نام ونشان نہ تھا۔

ویؔما کے پدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ساری زندگی قریوں میں گزری تھی۔ قریوں کی آب وہوا' فطری مناظر' پہاڑوں' پرندوں' چرندوں وغیرہ کا ذکر ویؔما کے پدوں

میں ملتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود ایک کسان تھا اور اس نے کسانوں کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ چناں چہ اس نے ان کی بدحالی کا ذکر اپنے کئی پدوں میں کیا ہے۔ اکثر کسان زمین داروں کے قرض دار رہتے تھے۔ انکی زمیں ہر وقت انکے پاس گروی رہتی۔ جب یہ قرض ادا نہ ہوسکتا تھا تو کسان زمیں داروں کے مزدور بن جاتے تھے۔ ایسی حالت میں کسان اپنی زمیں چھوڑ کر گاؤں سے نکل جاتے تھے۔ اس طرح زمیں دار کسانوں پر ظلم ڈھایا کرتے تھے۔

ویما لکھتا ہے:

راجہ زمیں ہڑپ لیتا ہے
اس کو آہ ضرور لگے گی
اُچھالی گئی گیند
کب تک اوپر رہ سکتی ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۶۴۵)

راجہ اور زمین دار ہی نہیں بلکہ تاجر پیشہ لوگ بھی راجاؤں کی مدد سے عوام کو ستایا کرتے تھے۔

تاجر راجاؤں سے مل کر
لوٹتے ہیں عوام کو
وہ سب ایک سے بڑھ کر ایک
جواری ہیں

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۳۲۴)

عوام پر ہونے والے مظالم کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ انصاف بھی بک رہا تھا اور انصاف کرنے والے بھی۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تو انصاف کو پیسوں میں تولا جاتا تھا۔

اس طرح عہد ویدا میں اعلیٰ اخلاقی اقدار مٹ چکے تھے۔ عوام لٹیروں کے ہاتھوں لٹ جاتے تھے۔ مفلسی، بے کاری، جہالت وغیرہ سماج میں گھر کر چکے تھے۔

مذہبی پس منظر:

عہد ویدا میں ہندو مذہب کی کئی شاخیں تھیں۔ ان مسالک کا مختصر سا تعارف اور ان کی حقیقت پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ ادویتا اس دور کا ایک اہم مسلک تھا۔ اس کے بانی سنکرا چاریا تھے۔ انہیں آدی سنکرا چاریہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ آٹھویں صدی کے مذہبی مفکر تھے۔ اس مسلک کا خلاصہ یوں ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں (پدراتھ) ایک ہی اصل (مول پدارتھ) سے بنی ہیں۔ اور بن رہی ہیں۔ اس اصل کو آتما (روح) یا برہما کہتے ہیں۔ یہی اصل اور لا فانی ہے۔ باقی سب فانی ہیں۔ لاعلمی کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اصل میں یہ ایک ہی ہے۔ اس فرق کو سمجھنا، اصل کی طرف آنا اور خود میں برہما کو پہچاننا ہی نجات (موکش) کا باعث ہے۔ یہی حق ہے۔ اس حق کو دریافت کرنے کے طریقہ دھیان (ریاض) اور ہٹ یوگ ہیں، جس میں جسم، دماغ اور نفس پر قابو پانے کے سخت سے سخت طریقے بتائے گئے ہیں۔

(تواوتلو جلد دوم، ص:۱، ۹، ۴۰)

ادویتا کا نظریہ بعض مخصوص لوگوں میں مقبول ہوگیا، مگر عام لوگ اس مذہب کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ کیوں کہ اس مسلک میں دھیان کے طریقوں میں سختی پائی جاتی ہے اور

اسکے لئے یکسوئی کی بھی ضرورت ہے۔عوام نے برہما کے ایک روپ کوکئی روپ دے دئے اور اپنی حاجات اور ذاتی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی بت بنا لیئے' جیسے گھر کا دیوتا الگ، خاندان کا الگ، گاؤں کے دیوتا الگ وغیرہ۔شرما نے اپنی کتاب ''ویمنا'' میں لکھتا ہے:

ఉపాసన సాధనములుగా నుండవలసిన విగ్రహములు దేవతలుగా తలపడెను. సంఘదేవతలు జాతి దేవతలుగను, ఊరి దేవతలుగును, ఇంటి దేవతలుగను అవతార భేధములు దాల్చవలసిన వచ్చెను. (వెమన : పేజి - 75)

ترجمہ:

عبادت کے لئے دل ودماغ میں رہنے والے خدا (برہما) کو
لوگوں نے دیوتاؤں کی شکل دے دی۔ یہ دیوتا، گھر کے
دیوتا' گاؤں کے دیوتا، خاندان کے دیوتاؤں میں تبدیل
ہوگئے ''

(ویمنا،ص:۷۵)

ویمنا کے دور میں اودیتا کا یہی طریقہ رواج پا گیا تھا۔لوگ مختلف دیوتاؤں کے بت بنا کر انکی پوجا کرنے لگے تھے۔ویمنا کے اکثر پدوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اودیتا کے نظریہ سے بہت متاثر تھا اور اسکا معتقد بھی تھا۔وہ اودیتا کے نظریہ کا قائل تھا کہ خدا ایک ہے اور وہ انسان میں موجود ہے۔ویمنا لکھتا ہے۔

برہما کہیں اور نہیں
خود میں موجود ہے
جس نے خود کو پہچان لیا
اس نے خدا کو پہچان لیا

(ویمنا پدیا رتنا کر مو،ص:۳۲۸)

ویمّا کے ہاں کئی پد ایسے ہیں جس میں وہ مختلف دیوتاؤں کے وجود سے انکار اور بتوں کی پوجا کی مخالفت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

وہ لوگ بے وقوف ہیں جو

ظاہر میں خدا کو تلاش کرتے ہیں

خدا اپنے ہی اندر موجود ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۳۱)

ویمّا کے دور میں ادویتا کا نظریۂ توحید ختم ہو چکا تھا۔ لوگ کئی خداؤں کو ماننے لگے تھے۔ اور ظاہری رسوم کو زیادہ ترجیح دی جانے لگی تھی۔ اور کئی بُت پوجے جانے لگے تھے۔ لوگوں کے دلوں سے مذہب ادویتا کی روح غائب ہو چکی تھی۔

ویمّا کے دور میں جو مذہب سب سے زیادہ غالب رہا، وہ ویر شیومت تھا۔ شیومت بارھویں صدی کی مذہبی تحریک تھی، جسے باسوانے شروع کی تھی۔ یہ تحریک سماج کی بے اعتدالیوں کو دور کرنے کے مقصد سے شروع کی گئی تھی۔ اس لئے عوام میں مقبول ہو گئی تھی۔ اسکے بنیادی اصول یہ تھے؛ ایک شیو کی پوجا، ذات پات میں فرق نہ کرنا، مساوات قائم کرنا، عورت اور مرد میں برابری رکھنا، چھوت چھات کو ختم کرنا وغیرہ۔ چناں چہ اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق کو دور کرنے کے لیے مختلف ذاتوں میں آپس میں شادیاں کروائی گئیں۔ مساوات کی ضرورت کا احساس دلایا گیا۔ اور انسانیت کے نظریہ کو عام کیا گیا۔ شیومت ملک میں بڑی تیزی سے پھیلتا گیا۔ سری پنڈت، ملی کارجنا پنڈت، اور پال کوری سومناتھ وغیرہ نے آندھرا میں شیومت کی تبلیغ و اشاعت کی۔ اس میں ہر مذہب اور ہر ذات کے ماننے والوں کا استقبال کیا گیا۔ کم ذات اور برہمن دونوں ان کی نظر میں ایک تھے۔ شیومت ایک فطری مذہب ہونے کے ناطے آندھرا میں پھیلتا گیا۔ مگر مرورِ ایام

کے ساتھ شیومت میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں ۔عہد ویماؔ میں شیومت دو بڑے فرقوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ایک ''آرادھیا'' جو براہمن تھے ، دوسرے جنگال'' جن میں غیر براہمن تھے ۔ان دونوں نے اپنے طور پر عبادت کے نئے طریقے ایجاد کر لیے ، نئے گرو بنائے گئے ، نئے نظریہ نکالے گئے ۔شیو کے درشن ،شیو کی پوجا ،شیو کے بھجن وغیرہ جیسے ظاہری ارکان پر توجہ دی جانے لگی ۔اس طرح ویماؔ کے دور میں شیومت ایک فرقہ پرستوں کا مذہب بن چکا تھا۔

اس دور پر اثر کرنے والے مذہبوں میں وشنومت یا وایشنوزم ہے ۔"وشنو" ان کے بھگوان ہیں ۔ویماؔ کے دور تک اس مسلک کے بھی تنگلا اور وڑگکلا نامی دو ٹکڑے ہو گئے ۔ یہ دوفرقے ایک خدا بھگوان وشنو کے بھکت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے تھے ۔ان دونوں میں تلک لگانے کے طریقے پر جھگڑا ہوا کرتا تھا۔اس طرح کے ظاہری ارکان پر لڑائیاں ہوا کرتی تھیں ۔

وشنومت کے فرقوں کے آپسی اختلافات کے ساتھ ساتھ شیومت اور وشنومت میں بھی اختلافات اتنے بڑھ چکے تھے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے ۔ایک دوسرے کی جسم سے مس ہونے پر غسل کرلیا کرتے تھے ۔

شیو بھکت شیو کے لنگ کو گلے میں ،سر پر یا ہاتھ میں باندھا کرتے تھے ، جب کہ وشنو بھکت پیشانی اور ہاتھوں پر تلک لگایا کرتے تھے ۔شیو بھکت شراب اور گوشت کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے ۔اس کے برعکس وشنو بھکت اسے استعمال کیا کرتے تھے ۔ یہ لوگ اپنے بھگوان وشنو کی بڑائی بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ شیو کو وشنو ہی نے پیدا کیا تھا۔اس لیے کسی بھی حالت میں شیو وشنو کے برابر نہیں ہوسکتا۔شیو بھکت کا کہنا ہے کہ تمام بُرے کام وشنو کی ایجاد ہیں ۔ اس طرح شیو بھکت اور وشنو بھکت ایک دوسرے کو

برا بھلا کہتے تھے۔ اور آپس میں لڑا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالتے تھے۔ کپڑے پھاڑ دیتے، لڑائی بڑھ کر خون خرابہ پر ختم ہوتی تھی۔ ویما کے دور میں مذہب منافقوں اور فرقہ پرستوں کی جماعت کا نام بن چکا تھا۔ تاکہ اپنی کتاب'' ویمنا'' میں ویما کے مذہبی دور کے تعلق سے لکھتا ہے۔

" Religion , in a word , beomes organized hypocrasy "

(Vemana, page-4)

ترجمہ:

لفظ مذہب کے معنی منافقانہ تنظیم کے ہو چکے ہیں۔

ویما کے دور تک تقریباً سارے آندھرا پردیش پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اکثر مسلمان شہروں میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کی تہذیب، معاشرتی زندگی اور حکومت کا اثر ہندوون پر پڑنے لگا۔ ہندومت اور اسلام میں بنیادی طور پر اختلافات پائے جانے کی وجہ سے ان دونوں میں تناؤ قائم رہنے لگا۔ مگر اس تناؤ نے کبھی تشدد کی شکل اختیار نہیں کی۔ ہندومت کئی فرقوں میں بٹ چکا اور ہر فرقہ کمزور اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ غریب اور کمزور سب اسلام میں داخل ہوتے گئے اور اسلام آندھرا میں پھیلتا گیا۔

ویما اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ایک پد میں شیو بھکتوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

شیو بھکتوں میں چور پیدا ہو گئے ہیں
وہ آپس میں ایک دوسرے پر الزام دیتے ہیں
یہ سب ترکوں (مسلمانوں) کے
ہاتھوں مٹی میں مل جائیں گے

(پرجاکوی ویمنا، ص: ۱۲۷)

اس طرح ویمّا کے دور میں ادویتا کا نظریہ ءتوحید' کئی خداؤں کی پرستش میں بٹ گیا تھا۔ شیومت اور وشنومت کے کئی ٹکڑے ہوگئے تھے اور ان میں ظاہری ارکان کو لے کر طرح طرح کے آپسی جھگڑے ہونے لگے تھے۔ چناں چہ اسی وقت مذہب اسلام کا اثر لوگوں پر پڑنے لگا۔

ادبی پس منظر:

سترھویں صدی میں تلگو کی روایتی شاعری صرف درباروں اور پنڈتوں کی محفلوں تک محدود رہی۔ شاعری تفریح کا ایک ذریعہ بن چکی تھی' جس میں حقیقی زندگی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ادب برائے ادب کا زور تھا اور وہ بھی درباریوں اور پنڈتوں کے لئے مخصوص تھا۔ گوپی نے اپنی کتاب ''پرجا کوی ویمنا'' میں لکھا ہے کہ اس دور میں مافوق الفطرت کہانیوں اور عشق و محبت کی باتوں کو شاعر اپنی شاعری کا موضوع بنایا کرتے تھے۔ ان موضوعات سے ہٹ کر لکھنے والا شاید ہی کوئی شاعر ہوا ہو۔ (پرجا کوی ویمنا، ص:۲۰۹)

ایک طرف روایتی شاعری کا زور تھا تو دوسری طرف چھتریا اور رام داس جیسے شاعروں نے دیسی (عوامی) زبان میں پد، کیرتن اور بھجنوں کے ذریعہ ہندومت کا پرچار کرنے لگے۔ اسی دور میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے لگاتار حملوں نے ہندو راجاؤں کو کمزور بنا دیا تھا۔ سماج کی بری درگت ہوگئی تھی اور ہندو مذہب کی بنیادیں کمزور ہوگئی تھیں۔ اس حالت کو دیکھ کر اس دور کے مذہبی مبلغین نے مذہب اور سماج کو سنبھالنے کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ سُرووَرم پرتاپ ریڈی نے لکھا ہے۔

> ''مسلمانوں اور عیسائیوں کے حملوں کے دوران آندھرا پردیش
> کی جس نے حفاظت کی، وہ راجہ نہیں تھے بلکہ مذہبی مبلغین تھے۔
> یہ لوگ سارے دیس میں پھرا کرتے اور نظموں، بھجنوں اور

کیرتنوں کے ذریعہ مذہبی عقائد کی اشاعت کرتے اور سماج کی
برائیوں کو سدھارا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں میں ویمنا یوگی اور
پوتالوری ویر برہم کے نام اہم ہیں"۔

(آندھرا لا چرترا،ص:۳۹۱)

سماج کی اس بدحالی کو دیکھ کر ویمؔا جیسے حساس انسان کا دل پکار اٹھا اور وہیں سے
ویمؔا کی شاعری کا آغاز ہوا۔

ویمؔا نے اپنی شاعری نہ درباریوں کے لیے لکھی نہ پنڈتوں کے لئے اور نہ ہی اپنی
شاعری کا موضوع کسی ایک مذہب کی تبلیغ کو بنایا۔ ویمؔا نے اپنی شاعری میں حقیقت کو دریافت
کرنے کی کوشش کی، عوام میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی اور سماج کے مختلف شعبوں پر اپنے
خیالات وتاثرات کا اظہار کیا۔ یہ موضوعات اسوقت تلگو ادب میں نئے تھے۔

شرما اپنی کتاب ویمنا میں لکھتا ہے کہ ویمؔا ہی پہلا شاعر ہے جس نے سماج کو اپنی
شاعری کے موضوع کے طور پر چنا ہے۔ اور وہ تنہا بہادر ہے جس نے سماج کی برائیوں کو
دور کرنے کی سعی کی ہے۔ (ویمنا، ص:۱۳۹)

اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے گوپی نے موضوعات کی بنا پر ویمؔا کو پہلا عوامی
شاعر کہا ہے۔

" వేమన ఎన్నుకున్న వస్తువు చాతుర్వర్ణ వ్యవస్థ మీద ఖండన, ఆర్థిక అసమానతల
నిరాకరణ అమానుష విలువలన్నింటి మీద ధ్వజమెత్తడం.
ఇవన్నీ తెలుగు సాహిత్యంలో మొదటిసారిగా వేమన్నకు
కవితా వస్తువులునాయి (ప్రజాకవి వేమన - పేజి - 208)

ترجمہ:
"ویمؔا نے اپنی شاعری میں رنگ وذات کے نظام کی مخالفت کی

ہے۔ اونچ نیچ کو نہیں مانا، تو ہم پرستی کی خلاف ورزی کی ہے
۔۔۔۔۔۔۔ یہ موضوعات اس وقت تک تلگو ادب میں نہیں
تھے۔ اور ویمنا ہی پہلا شاعر ہے جس نے ان موضوعات پر قلم
اٹھائی ہے۔''

(پرجا کوی ویمنا، ص: ۲۰۸)

ویمنا نے اس دور کی روایتی' اور عشقیہ شاعری جو صرف لفاظی ہوا کرتی تھی کو چھوڑ کر اصلی اور سچی شاعری کی، جس کا موضوع سماج تھا۔ اس طرح اس نے تلگو ادب میں ایک نئی شعری دبستان کا آغاز کیا، جس کا موضوع سماج تھا۔

۲۔ حیاتِ ویمنا

ویمنا کی معروف کہانی:

۱۹۱۳ء میں پورنیا چاری نے اپنی کتاب ویمنا یوگیندرا چریترامو (یوگی ویمنا کی تاریخ) میں ویمنا کی زندگی کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ویمنا کی زندگی ہمیں ایک تاریخی حقیقت نہیں، بلکہ ایک کہانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ لوگ آج بھی اسی کہانی کو سننا پسند کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دونتی آلیا ریڈی' ریڈی راجاؤں کا بانی تھا، جو انوماکنڈا گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ راجا ہونے سے پہلے ایک امیر کسان تھا۔ اس کے امیر ہونے کا راز یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ویمنا نامی ایک تاجر بھگوان شیو کے درشن کے لئے آندھرا میں واقع سری سَیلم کے مشہور شیو مندر کو پہنچتا ہے۔ شیو کے درشن اور پوجا ہو جانے کے بعد ویمنا وہیں کھڑا رہا۔ پوجاریوں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کے وہ چھ ماہ شیو کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

پجاریوں نے ویما کی لگن کو دیکھ کر مندر میں رہنے کی اجازت دے دی اور ساتھ میں یہ تاکید کر دی کہ وہ مندر کے شمال میں واقع جنگل کی طرف نہ جائے گا کیوں کہ وہاں زہریلے سانپ اور درندے رہتے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد ویما کو یہ خواہش ہوئی کہ وہ مندر کے شمال کی جانب جنگل میں جا کر دیکھے کہ وہاں ہے کیا؟ وہ نکل پڑا۔ ویما کو اُدھر ایک جادوئی چشمہ نظر آیا، جس میں لوہے کو ڈبونے سے لوہا سونے میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ویما اس جادوئی پانی کو دو مٹکوں میں بھر کر اپنے گھر کی طرف چل پڑتا ہے۔ دورانِ سفر اندھیرا چھانے پر انوما کنڈا نامی ایک گاؤں میں دونتی آلیا ریڈی کے گھر پر ٹھرتا ہے ۔ ویما مٹکوں کو گھر کے پچھواڑے تبیلہ میں چھپا کر کھانا کھانے کے لئے باہر نکلتا ہے۔ اس دوران مٹکوں کا تھوڑا پانی بہہ کر وہاں پر رکھے ہوئے لوہے کے سامان کو سونے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جب مکان کا مالک جانوروں کو چارہ ڈالنے کے لئے تبیلے پر جاتا ہے تو سونے میں بدلے ہوئے لوہے کو دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے۔ اسکی نیت بدل جاتی ہے۔ وہ تبیلے کے جانوروں کو باہر نکال کر تبیلے کو آگ لگا دیتا ہے اور اس جادوئی پانی کو گھر میں چھپا دیتا ہے۔ جب تاجر ویما کھانے سے فارغ ہو کر لوٹتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ سارا تبیلہ جل رہا ہے۔ وہ اپنے مٹکوں کو لینے کی خاطر اس آگ میں کود پڑتا ہے اور اسی میں جل کر مر جاتا ہے۔ دونتی آلیا ریڈی اس جادوئی پانی کو استعمال کر کے امیر بن جاتا ہے۔ مگر یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔

آلیا ریڈی امیر ہونے کے باوجود ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ اسے تاجر ویما کا بھوت ستایا کرتا تھا اور اسکی اولاد کم عمری میں ہی فوت ہو جاتی تھی۔ اسے ہر وقت یہ پریشانی رہتی تھی کہ اس کے خاندان کو کون آگے بڑھائے گا۔ ایک رات تاجر ویما آلیا ریڈی کے خواب میں نظر آتا ہے۔ ریڈی رو کر اس سے معافی کی درخواست کرتا ہے اور اولاد نہ ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ تب ویما اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے دو شرائط رکھتا ہے۔

پہلی یہ کہ وہ اس کا سونے کا بت بنائے اور بطورِ خاندانی دیوتا اسکی ہر روز پوجا کرے۔ دوسری یہ کہ ریڈی کی ہونے والی ہر اولاد کے نام کے ساتھ ویما کا نام جوڑے۔ اگر ایسا کرے تو وہ ریڈی کے خاندان کو سو سال تک شان و شوکت کے ساتھ راج کرنے میں مدد کرے گا۔ صبح ہوتے ہی آلیا ریڈی سُنار کو بلوا کر ویما کا سونے کا بت بنواتا ہے اور ہر روز اس کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ آلیا ریڈی کے تین بیٹے ہوتے ہیں۔ ریڈی ان تینوں کے ناموں کو ویما کے نام سے جوڑ دیتا ہے۔ ان کے نام تھے: پرولیا ویما ریڈی، اناوتا ویما ریڈی اور اناویما ریڈی۔ آلیا ریڈی اپنے سارے خاندان کو لے کر ضلع گنٹور کے ایک چھوٹے سے شہر کنڈاویڈو میں ۱۳۲۳ء میں منتقل ہو جاتا ہے۔

آلیا ریڈی جادوئی پانی کے مسلسل استعمال سے وہ وہاں کا سب سے بڑا زمین دار بن جاتا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا پرولیا ویما ریڈی فوج اکٹھا کر کے پڑوسی راجاؤں کو ہرا دیتا ہے۔ اور ۱۳۲۸ء سے بحیثیت خودمختار راجہ حکومت کرنے لگتا ہے۔ اس نے ۱۳۲۸ء سے ۱۳۴۰ء تک مسلسل بارہ سال حکومت کی تھی۔ پرولیا ویما ریڈی کی وفات کے بعد اسکا دوسرا بھائی انووتا ویما ریڈی تخت نشیں ہوا۔ اس نے ۱۳۴۰ء سے ۱۳۷۰ء تک تیس سال حکومت کی۔ انووتا ویما ریڈی کی وفات کے بعد اسکا چھوٹا بھائی بارہ سال حکومت کر کے اپنے بیٹے کومر گری ویما ریڈی کو ۱۳۸۲ء میں حکومت کی ذمہ داری سونپ دی۔ راجہ کومر گری ویما ریڈی اور رانی ملتا کے تین بیٹے ہوئے، جن میں تیسرا بیٹا ویما ریڈی ہے جو شاعر ویما ہے۔ کومٹی ونکا ریڈی نے ۱۳۹۶ء سے ۱۴۲۴ء تک اور راجا ویما ریڈی نے ۱۴۲۴ء سے ۱۴۲۸ء تک حکومت کی تھی۔ راجا ویما ریڈی کا اپنے ہی سپہ سالار کے ہاتھوں قتل ہو جانے سے ۱۴۲۸ء میں آلیا ریڈی راجہ کے خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔ جس طرح تاجر ویما نے آلیا ریڈی کے خواب میں آکر وعدہ کیا تھا کہ وہ سو سال تک اُن سے راج کروائے گا۔ اسی طرح ۱۳۲۸ء میں ان کی حکومت شروع ہو کر ٹھیک سو سال کے بعد ۱۴۲۸ء میں ختم ہوئی۔

یہاں سے شاعر ویمؔا کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ ویمؔا اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلا تھا۔ اسے ہر بات کی چھوٹ حاصل تھی۔ بچپن سے ہی اس کی عادتیں بگڑتی گئیں چناں چہ وہ ایک غیر ذمہ دار انسان بن گیا۔ والدین کی وفات کے بعد ویمؔا کو اور زیادہ آزادی مل گئی۔ دونوں بڑے بھائی ریاستی کاموں میں مصروف تھے۔ لہذا ویمؔا پر دھیان دینے سے قاصر تھے۔ ویمؔا محل کا سارا مال دیوداسیوں پر خرچ کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک دیوداسی کے پیار کے جال میں پھنس گیا۔ کم عمری ہی میں والدین کے سائے سے محروم ہو جانے کی وجہ سے ویمؔا کی بھابی نرساماؔ اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ بھی اپنی بھابی کی بہت عزت کرتا تھا۔ تاہم محل کے باہر ویمؔا کی عیاشی پروان چڑھتی رہی۔ بلکہ جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ایک دن ویمؔا کی محبوب دیوداسی نے فرمائش کی کہ وہ اپنے بھابی کے سارے خاندانی زیورات لاکر اسے دے دے۔ تاکہ وہ اسے ایک بار پہن کر خود کو آئینہ میں دیکھے۔ نرساماؔ نہ چاہتے ہوئے بھی ویمؔا کا دل رکھنے کے لئے اسے سارے خاندانی زیورات دے دیتی ہے۔ مگر ایک نتھ کو اپنے پاس رکھ لیتی ہے جو خاندان کی نشانی تھی۔ دیوداسی ویمؔا سے اس نتھ کی بھی فرمائش کرتی ہے۔ جب ویمؔا نتھ کو حاصل کرنے کے لئے اپنی بھابی پر زور دیتا ہے تو نرساماؔ ویمؔا کو نتھ دیتے ہوئے یہ شرط رکھتی ہے کہ وہ اس نتھ کو دہلیز پر رکھ دے اور دیوداسی کو برہنہ ہو کر پیٹھ کے بل جھک کر اُسے اٹھانے کو کہے۔ اور وہ یہ سارا منظر دیکھے۔ جب ویمؔا اس منظر کو دیکھتا ہے تو اسے عورتوں سے گھن ہونے لگتی ہے۔ وہ جنسی خواہشات کو ترک کر دیتا ہے اور نرساماؔ کے کہنے پر حکومت کے کام سنبھالنے لگتا ہے۔

ویمؔا شاہی زیورات کا کام سنبھالنے لگا۔ ابھی راما ایک درباری سنار تھا جو ہر روز صبح دیر سے آیا کرتا تھا۔ جب بھی ویمؔا وجہ دریافت کرتا تو وہ اسے ٹال دیا کرتا تھا۔ وجہ معلوم کرنے کی خاطر ویمؔا دوسرے دن صبح اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ابھی راما سورج نکلنے سے پہلے

غسل سے فارغ ہوکر کچھ پھل اور تازہ دودھ لے کر غار میں عبادت میں مشغول بیٹھے ہوئے شیو یوگی کے پاس جاتا ہے۔ یوگی ابھی راما کی کئی دنوں کی خدمت سے خوش ہوکر کہتا ہے کہ وہ کل صبح اس جگہ کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس لئے ابھی راما سورج نکلنے سے پہلے یہاں آجائے تاکہ وہ اسے روحانی فیض عطا کرے۔ ویمنّا اس گفتگو کو سن کر محل واپس آتا ہے اور اُس رات ابھی راما کو ایک زیور بنانے میں مصروف کر دیتا ہے۔ دوسرے دن صبح ویمنّا خود اس یوگی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ یوگی ابھی راما کا انتظار کرتا ہے۔ وہ نہ آنے پر ویمنّا کے کان میں کچھ پڑھ کر پھونک دیتا ہے اور اپنی انگلی سے زبان پر کچھ لکھ دیتا ہے۔ تب سے ویمنّا کی زبان میں تاثیر آجاتی ہے اور وہ شاعری کرنے لگتا ہے۔ ابھی راما کو دھوکا دینے کی معافی مانگتا ہے اور اس سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس کا نام استعمال کریگا۔

اس وقت سے ویمنّا یوگی بن جاتا ہے، گھر بار چھوڑ کر شہر شہر پھرتا ہے اور اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے۔ ویمنّا سے کرامات بھی سرزد ہوتی ہیں۔ جیسے خربوزے کے بیجوں کا سونا بن جانا، تانبے کے سکوں کو سونے میں تبدیل کرنا، اپنا پیٹ چیر کر اپنے ہاتھوں سے آنتوں کو صاف کرنا وغیرہ۔ ویمنّا نے اپنی باقی زندگی ایک یوگی کی طرح گزاری اور وہ اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کے حقیقی بیان کرتا پھرتا رہا۔ اس طرح پورنیاچاری نے ویمنّا کے حالاتِ زندگی کو بیان کیا ہے۔

حالاتِ زندگی:

ویمنّا کی زندگی کے حالات اس کی شاعری کے ذریعہ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس باب کے شروع میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پورنیاچاری کا بتایا گیا شجرہ اور تواریخ غلط ثابت ہو چکے ہیں اور اس کی کہانی میں جو مافوق الفطرت واقعات بیان ہوئے ہیں انہیں ہمارا ذہن قبول نہیں کرتا۔ چناں چہ یہ کوشش کی جاسکتی ہے کہ ویمنّا کی شاعری کے ذریعہ اس کی زندگی کبھے

حالات کو اکھٹا کیا جائے۔ تلگو کے ادیبوں نے اس طرح کی سعی و کاوش کی ہے۔ ان میں آرُ درا، رالآ پلی انت کرشنا شرما، نارلا اور گوپی کے نام اہم ہیں۔ ان ادیبوں میں ویما کی زندگی کے متعلق چند باہمی اختلافات ہونے کے باوجود کچھ باتیں مشترک ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ان کے نزدیک ویما ایک معمولی انسان ہے نہ کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد۔ اسی بنیاد پر انھوں نے ویما کی زندگی کو اس کی شاعری کے ذریعہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ویما کا بچپن، جوانی کی عیاشی، ازدواجی زندگی اور ویما کی فقیرانہ زندگی جیسے اہم نکات پر یہ تمام ادیب اتفاقِ رائے رکھتے ہیں۔

ویما سترھویں صدی میں آندھرا کے علاقہ رائل سیما کے ایک کاپو کسان گھرانے میں پیدا ہوا۔ کسانوں کے تعلق سے ویما نے کئی ایسے پد کہے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ خود کسان تھا، کسانوں کا ہمدرد تھا اور خود کو کاپو کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

کاپو کسان، زمین داروں کے ہاں کثرت سے محنت کیا کرتے تھے۔ مگر اپنی محنت کا معاوضہ مانگنے سے ڈرتے تھے۔ ویما انہیں احمق قرار دیتے ہوئے ان کی دلجوئی یوں کرتا تھا۔

کاپو کتنے احمق ہیں
کتنی زیادہ محنت کرتے ہیں
انکی محنت سے ان کے پاپ کم ہوجائیں گے

(پرجا کوی ویمنا، ص:۱۳۴)

ویما جانتا تھا کہ وہ کاپو کسان ہونے کے باوجود اُس نے دنیا کو حقیقت سے روشناس کرایا ہے۔ جو کاپو ذات کے لئے فخر کا باعث ہے۔ لکھتا ہے:

کل یُگ میں ویما نے کاپو ذات کو عزت بخشی ہے

دنیا کے لوگوں کو اسی نے اپنا سب کچھ دیا ہے

اور حق کا پیام پہنچایا ہے

(پرجا کوی ویمنا، ص:۷۲)

ویما ایک ایسے کاپو گھرانے میں پیدا ہوا جو امیر تھا۔ جس کے پاس زراعت کے لئے زمین، بیل، گائے، بکریاں وغیرہ رہا کرتے تھے۔ زمین سے اچھی خاص آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ اچھا کھانا ،لوگوں میں اپنا وقار قائم رکھنا اور پُرسکون زندگی گزارنا ان کا معمول تھا۔ ویما کی ایک پد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عمدہ ذائقے کا شوقین تھا جو امیروں کے کردار کا خاصہ ہے۔ ویما لکھتا ہے:

بغیر گھی کے چاول گھاس کے برابر ہے

بغیر سالن کا کھانا کُتے کا کھانا ہے

جو کھانا بغیر محبت سے کھلایا نہیں جاتا

وہ حلق سے نگلا نہیں جاتا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو،ص:۵۶۲)

ویما ایک امیر لڑکا ہونے کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کے اس نے اپنی ابتدائی تعلیم پنڈتوں کے ہاں حاصل کی ہوگی۔ شاعری کی مشق بھی کی ہوگی۔ اور رامائن مہا بھارت وغیرہ شاستروں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ویما اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ دن بھر کام کرتا، فطرت کے مزے لوٹتا اور رات میں گاؤں کی کٹ پتلیوں کے کھیلوں میں رامائن اور مہا بھارت کے کھیلوں کو دیکھا کرتا۔ ویما خیر و شر کے فرق کو بتاتے ہوئے رامائن اور مہا بھارت کے حوالے دیتا ہے۔

سری رام نے اپنے خاندان کا نام اونچا کیا

دُریودھن نے سارے خاندان کو برباد کیا

یہی خیر و شر کی حقیقت ہے۔

وِیمَا والدین کی بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ اور وہ ماں کا لاڈلا تھا۔ لکھتا ہے :

سب خیراتوں میں کھانا کھلانے بہتر ہے

ماں باپ سے بڑھ کر کوئی نہیں

استاد کا درجہ اعلیٰ ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص: ۴۷۶)

ایک اور پد میں والدین کی خدمت کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ماں باپ پر رحم نہ کرنے والی اولاد کا

رہنا، نا رہنا ایک ہے

وہ اُن کیڑوں کی مانند ہے

جو مٹی میں پیدا ہو کر

مٹی میں ہی مر جاتے ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص: ۴۹۸)

وِیمَا کی نوجوانی ہی میں اس کی ماں کے مرجانے سے اس کی زندگی میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ باپ دوسری شادی کر کے سوتیلی ماں کو لاتا ہے۔ وِیمَا ماں کے غم میں ہمیشہ اداس رہتا ہے۔ وِیمَا اور اس کی سوتیلی ماں کی اکثر نہیں بنتی تھی۔ وہ وِیمَا کی شکایتیں اس کے خاوند سے کیا کرتی تھی۔ سوتیلی ماں کی سختیوں اور ذلتوں سے وِیمَا پریشان ہو جاتا ہے۔

اوراس کا باپ بھی اس سے لاپرواہو جاتا ہے۔ ویما سوتیلی ماں کے تعلق سے اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتا ہے۔

سوتیلی ماں ہر وقت تمہارے نقص ڈھونڈتی ہے
وہ تم پر کبھی رحم نہیں کرتی
انسان کوایسی نظر پیدا کرنی چاہیے
جس سے انسان کی فطرت کو پہچان لیا جائے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص: ۲۲۵)

سوتیلی ماں کی سختیوں کو جھیلتے ہوئے ویما کو اپنی ماں کی محبت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جب تمہاری ماں زندہ ہے تم مزید پیار کئے جاؤ گے
ماں کے مرنے کے بعد تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا
اپنے لئے تم کچھ بہتر کرلو
جب تمہارا وقت اچھا ہوتا ہے

.(نلکا بینا نیلالو ویمنا پدیالو، ص ۹)

اسی دوران ویما کو ایک دیوداسی سے محبت ہو جاتی ہے' جو اچھا گایا اور ناچا کرتی تھی۔ ویمااس دیوداسی پر اپنی دولت لٹانے لگتا ہے۔ اور اس کی ہر ادا پر مرمٹتا ہے۔ لکھتا ہے۔

عورت کے جسم کی خوب صورتی
ہر ایک کو بھاتی ہے

ایسا مرد دیکھنے میں نہیں آتا

جو عورت کا خواہش مند نہ ہو

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۰۵)

ایک اور پد میں عورت کی قربت کی اہمیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

انسان کو سب سے عزیز زندگی ہے

ہزار زندگیوں سے بھی عزیز دولت ہے

دولت سے بھی عزیز

جوان لڑکی کے میٹھے بول ہیں

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۸۹)

ویمنا کی عیاشی کو دیکھ کر اس کے باپ نے اس کی شادی کر دی۔ نئی دلہن سے ویمنا چند دن خوش رہا ہوگا۔ اس نے ایک اچھے خاوند کی ذمہ داری بھی نبھائی ہوگی۔ اسی لئے وہ دیوداسیوں کے جال میں پھنسنے والوں کو نالائق کہتا ہے۔ لکھتا ہے:

گھر کی عورت کو چھوڑ کر

پرائی عورت کے پیچھے پھرنا نالائقی ہے

جیسے اپنی فصل کو چھوڑ کر

چند دانوں کے لئے دوسروں سے مانگتے پھرنے کے برابر ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۷)

مگر ویمنا کی زندگی میں یہ خوشی قائم نہ رہ سکی۔ وہ اپنی بیوی اور سوتیلی ماں کے مسلسل جھگڑوں سے پریشان رہتا تھا۔ اس بے چینی سے کام پر اسکی توجہ کم ہونے لگی چناں

چہ کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔اور اس کی مالی حالت کمزور ہوگئی۔گھر سے پریشان ہوکر ویمنا پھر ایک بار دیوداسیوں سے ربط قائم کرنے لگتا ہے۔مگر پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ویمنا کو ان سے پہلے جیسی عزت نہیں ملتی ہے۔ ویمنا دیوداسیوں کی بے رخی سہہ نہیں پاتا ہےاوراس کے ذہین میں عورت کے تعلق سے منفی خیالات گھر کر جاتے ہیں۔ویمنا لکھتا ہے۔

جس طرح پرندہ کی پرواز کا کوئی راستہ متعین نہیں ہے
اور نہ ہی پانی پر چلتی ناؤ کا
اسی طرح عورت کی چال کو بھی
کوئی سمجھ نہیں سکتا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۰۵)

ایک اور پد میں لکھتا ہے۔

عورت ایک آگ ہےاور مرد موم کی مانند
جب مرد عورت کے قریب ہوتا ہے
وہ پگھل کر فنا و برباد ہو جاتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۳۴)

ادھر گھر پر بیوی کی نظروں میں ویمنا کی کوئی عزت نہیں تھی۔ویمنا اپنی بیوی اور گھر سے سخت پریشان تھا۔لکھتا ہے۔

بدگو عورت ہمیشہ چیختی ہے
وہ اپنے خاوند کی بھی عزت نہیں کرتی
وہ اپنے خاوند کو بیچ بھی سکتی ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۶۴)

ویمنا گھریلو زندگی کی اس پریشانی کو یوں بیان کرتا ہے۔

چپل میں اٹکا پتھر، کان میں پھنسا مچھر
آنکھ میں چبھتا تنکا، پیر کا کانٹا
اور گھر کی پریشانی
ناقابل برداشت ہیں

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۱۸)

ویمنا کا ماننا ہے کہ عورت بے وفا ہے۔ اسے آزادی نہیں دینی چاہیئے اور اسے ہروقت اپنے قابو میں رکھنا چاہیئے۔ لکھتا ہے

عورت کو قابو میں رکھنا چاہیئے
اگر ایسا نہ کرے تو مرنا بہتر ہے
قابو میں نہ رہنے والی عورت سے
گھر بسانا بیکار ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۵۶)

ایک اور پد میں کہتا ہے:

بیوی کو قابو میں نہ رکھنا نالائقی ہے
پہلے ہی اسے قابو میں لے لینا چاہیئے
ورنہ مشکل ہے۔ جیسے پودے کو
جھکانا آسان اور پیڑ کو مشکل

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۱۹۷)

شاید ویما کے قابو میں اس کی بیوی نہ آسکی تھی وہ اپنی قسمت پر روتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد سے بھی خوش نہیں تھا۔ لکھتا ہے۔

ایک سوکھا پیڑ جنگل کو جلانے کا باعث ہوتا ہے
اسی طرح بری اولاد
سارے خاندان کے نام کو
مٹی میں ملا دیتی ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو،ص:۹۷)

گھر کی پریشانیوں سے کام پر ویما کی توجہ نہ ہونے سے اسے ہر سال نقصان اٹھانا پڑا۔ بچی کچھی دولت دیوداسیوں پر لٹا دینے سے وہ غریبی میں مبتلا ہو گیا۔ ویما نے غریبی کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

غریب کے ہاں کھانا ہے نہ پیسہ
نہ ہی کمائی نہ ہی وہ جی سکتا ہے
اور نہ ہی وہ مرسکتا ہے
وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو،ص:۱۱۱)

ایک اور پد میں ویما لکھتا ہے۔

اگر پیسہ نہیں ہے تو
اولاد بھی طعنہ دیتے ہیں
بیوی قریب نہیں آتی
برداشت کی طاقت مرجاتی ہے

(ویمنا یدیا رتنا کرمو،ص:۳۰۱)

ویما کے لئے زندگی بوجھ بن چکی تھی۔ بچپن میں ماں کے مرجانے سے سوتیلی ماں کی سختیوں کو جھیلنا پڑا۔ باپ کی لاپرواہی کو برداشت کیا۔ دیوداسیوں سے محبت کی مگر ان کی مطلب پرستی سے دل اچاٹ ہوگیا۔ بیوی کی بے وفائی دیکھی اور بچوں کی نالائقی سہی۔ ویما سکون و چین کی تلاش میں گھریلو زندگی کو چھوڑ کر حق کی جستجو میں نکل پڑا۔ پنڈتوں کی محفلوں میں جا بیٹھا۔ مگر اسے ان کا علم کھوکلا معلوم ہوا۔ مختلف مسلکوں کے یوگیوں اور بیراگیوں کی خدمت کی مگر ان میں سے اکثر لوگ جھوٹے نکلے۔ ویما کی اس سچی لگن اور خدمت کو دیکھ کر شاید کسی یوگی نے ویما کو حقائقِ زندگی سے آشنا کیا ہوگا اور اس فن سے آگاہ کیا ہوگا کہ کیسے اس بے معنی زندگی کو کارآمد زندگی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

تب سے ویما کی بامعنی زندگی کا آغاز ہوا۔ ویما نے زندگی کے اتار چڑھاؤ اور اچھے برے کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے حق کو جلد پہچان لیا اور حقائقِ زندگی کو لوگوں میں عام کرتا رہا۔ ویما زندگی کو خدا کی دی ہوی ایک نعمت سمجھتا ہے اور خدا کو پہچاننا ہی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ ویما انسانیت کا وہ غیر معمولی نمونہ ہے، جس نے اپنی زندگی میں دوسروں کو امن وسکون کا پیام ہی نہیں دیا بلکہ وہ خود کامل انسان کے درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ توحید کے راستہ پر چل کر اس نے اپنی تہذیب کی تربیت کی تھی۔ اس کی تہذیب کا پیام کامل وحدت کا پیام تھا۔

ویما کی شخصیت:

ویما کی زندگی اور شخصیت کے تعلق سے کوئی مستند مواد موجود نہیں ہے۔ جو ہے وہ اس کی شاعری ہے۔ ویسے بھی شاعر کا کلام کم و بیش اس کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ ویما نے اپنی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس خصوص میں اپنے خیالات و تجربات کو بھی پیش کیا ہے، جس سے اس کی شخصیت پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

ویمنا کی شاعری پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی پھولوں کی راہ نہیں، خاروں کی پرُخار وادی تھی۔ ہر جا خطرناک موڑ تھے اور زمین اتار چڑھاؤ سے خالی نہ تھی۔ اس نے اپنے زمانے کے عروج و زوال کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ اس نے ایک عام انسان سے بڑھ کر مشکلیں جھیلی تھیں۔ مگر کبھی اس نے اپنے آپ کو مشکلات کا شکار ہونے نہیں دیا بلکہ وہ ان کا حل ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوا۔

ویمنا فطرتاً ایک جذباتی انسان تھا۔ اس کے کلام میں جذبات کی جو شدت اور گرم جوشی پائی جاتی ہے وہ پوری طرح اس کی شخصیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ ویمنا کا دور بڑا پرُآشوب تھا۔ حکمراں کمزور ہو چکے تھے اور مذہب کی روح غائب ہو چکی تھی۔ ان کے اثر سے ویمنا کی گرم جوشی نے بغاوت کا روپ دھار لیا اور اس نے کھل کر مذہبی عقاید سے بغاوت کی، وہ لکھتا ہے:

جن راجاؤں نے یہ خوب صورت مندر اور بت بنائے تھے
وہ جنگ میں ہار گئے اور مارے گئے
جبکہ ان بتوں کو جنھوں نے توڑ دیا ہے
وہ اب اسی زمیں پر راج کر رہے ہیں
کیا یہ بت اپنے بھکتوں کی حفاظت نہیں کر سکتے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۱۱)

یہ اور اس طرح کے کئی پد ہیں جن سے ویمنا کی باغیانہ شخصیت اور اس کی بے باکی ظاہر ہوتی ہے۔

ویمنا ایک عیاشی انسان تھا۔ اس کے کئی ایسے پد ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی عیاشی جنون کی حدوں سے گزر چکی تھی۔ اس عیاشی نے ویمنا کی مالی حالت اتنی کمزور کر دی تھی کہ وہ ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویمنا ایک جوان لڑکی کی قربت کی

خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

انسان کو سب سے عزیز اس کی زندگی ہے
ہزار زندگیوں سے بھی عزیز دولت ہے
دولت سے بھی عزیز جوان لڑکی کے بول ہیں

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۸۹)

ویما جانتا تھا کہ دیوداسیوں اور پرائی عورتوں سے رشتہ رکھنا ناجائز ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے لکھتا ہے۔

اس کا کُل مطالعہ اور خدائی کا تصور
مبہم ہو جاتا ہے، جب کہ وہ کسی
خوب صورت عورت کو دیکھتا ہے
اور اپنی ساری پارسائی بھول جاتا ہے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۱۷۸)

ویما نے ساری دولت عیاشی میں لٹادی تھی۔ اور وہ غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے دیوداسیوں نے ویما کو حقارت کی نظروں دیکھا تھا۔ اس وقت سے ویما کے ذہن میں عورتوں کے تعلق سے منفی خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے کئی پدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کا طرف دار نہیں تھا۔ وہ عورت کو فتنہ و فساد کی جڑ، برائیوں کا سر چشمہ اور مرد کی بربادی کی وجہ قرار دیتا ہے۔ ویما کا کہنا ہے کہ عورت کی چال کو مرد کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے ہر فعل پر نظر رکھنی چاہیے۔ اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور رہنا چاہیے۔ مزید کہتا ہے کہ عورت کی بات پر یقین کرنا نادانی ہے۔ ویما لکھتا ہے۔

جیسے ناؤ کی دریا میں مخصوص راہ نہیں ہوتی

جیسے ایک پرندہ کی آسماں پر کوئی راہ نہیں ہوتی

اسی طرح عورت کی بھی کوئی ایک راہ نہیں ہوتی

(ویمنا پدیارتنا کر مو،ص:۲۰۵)

ویمؔا عورت کو خود غرض قرار دیتے ہوئے کہتا ہے۔

جب پیسہ رہتا ہے عورت مرد کو چاہنے لگتی ہے

اور روپیہ ٹکا نہ ہونے پر،

جب مرد اس کے قریب آتا ہے تو وہ دور ہو جاتی ہے

یوں دیکھتی ہے جیسے وہ مرد نہ ہو ایک لاش ہو!

(ویمنا پدیارتنا کر مو،ص:۱۷۸)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ویمؔا نے یہ خیالات دیوداسیوں یا طوائفوں وغیرہ کے متعلق کہے ہیں۔ کیوں کہ ویمؔا کی نظر میں ایک اچھی عورت گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔ کہتا ہے:

اگر بیوی نیک ہو، اولاد ہونہار ہوں

اس کے لیے گھر جنت ہے

ایسے خوش نصیبوں کو

اور کسی جنت کی کیا ضرورت

ویمؔا نے امیری بھی دیکھی اور غریبی بھی۔ مگر وہ ہر وقت غریب کسانوں کا ہمدرد تھا۔ وہ خود کسان ہونے کے ناطے اس نے کسانوں کی مجبوریوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا۔ ویمؔا کا کہنا ہے کہ غریبی تمام پریشانیوں کی

جڑ ہے، کہتا ہے۔

غریب ایمان دار ہوتا ہے نہ ہی خود اعتماد
بیوی بچوں میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی
نہ ہی وہ سماج میں عزت سے رہ سکتا ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۱۸)

ایک اور پد میں ویمنا غریبی کو جنگل کی آگ سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

غریبی ایک جنگل کی آگ کی مانند ہے
جو خود کو جلا دیتی ہے
غریبی، سارے خاندان کے لئے
ایک لعنت ہے!

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۵)

ویمنا ایک حساس و ہمدرد انسان تھا۔ وہ غریبوں کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے غریبی کو دور کرنے کے لئے امیروں سے کہتا ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرے، لکھتا ہے۔

جب تم مرو گے کچھ نہیں لے جاؤ گے
نہ ہی تمہاری دولت
وہی تمہارے ساتھ آئے گا
جو تم نے دوسروں کو دیا ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۵۱۱)

اکثر، ایک غریب انسان کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں پر بہ حیثیت ایک ہمدرد انسان کے وہ یوں برس پڑتا ہے۔

غریب کی تکلیف صرف خدا کو معلوم

غریب کو جس نے انسان نہ سمجھا

وہ ہے ایک مردہ کے برابر

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۵۱)

انسان کا وہ عقیدہ کہ چند مخصوص رسمیں اور فرائض کے ادا کرنے سے اس کی زندگی خود بخود سیدھے راستہ پر لگ جاتی ہے۔ ایک خام خیال ہے۔ ویمنا ایک حقیقت پسند انسان تھا اور اس نے توہم پرستی کی مخالفت کی تھی۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو سمجھیں نہ کہ ان جھوٹے رسم و رواج کو ادا کرے۔ اس خیال کو ویمنا نے یوں واضح کیا ہے۔

قسمت پڑھنا، شیطان اتارنا، خوابوں کی تعبیر

سچ بھی ہوتی ہیں اور جھوٹ بھی

کیسے اعتماد کریں

انسان زندگی کے حقائق کو سمجھے اور غور کرے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۴۱)

زندگی کے حقائق کی جستجو میں ویمنا نے انسانوں کو ان کی خام خیالی سے آگاہ کیا ہے۔ کہ ان کا وجود محض جسمانی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر روحانی قوتیں بھی رکھتے ہیں۔

ویمنا نڈتوں کا مخالف تھا، جو علم محض اپنا پیٹ بھرنے کے خاطر حاصل کرتے ہیں۔

اور ظاہری ارکان ادا کرنے میں محو رہتے ہیں۔ ویما کا کہنا ہے کہ وید پوران کے رٹ لینے سے خدا حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا ماننا ہے کہ وہ علم ہی نہیں جس سے خدا کی پہچان نہ ہو سکے۔ جو لوگ کثرت سے مطالعہ کرتے ہیں، پر اپنے دل کو صاف نہیں رکھتے ان کے تعلق سے وہ لکھتا ہے۔

یہ تمام مطالعہ کس مقصد سے ہو رہا ہے
بیراگی زندگی سے کیا حاصل
شاستروں میں الجھ کر اپنے کو کیوں تباہ کرتے ہو
خدا کی پرستش کرو اور اس کو پہچانو
کہ تمہارے دل میں وہ آباد ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۶۲۱)

جو لوگ بغیر مقصد کے مطالعہ کرتے ہیں وہ اپنے ہی علم کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اور وہ کبھی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچتے۔ ویما اس خیال کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

مطالعہ کی زیادتی خیالی خواہشوں کو پیدا کرتی ہے
انسان اس کے ذریعہ خدا کو حاصل نہیں کر سکتا
جیسے ریشم کے کیڑے
اپنے خیالوں کے جال میں پھنس جاتے ہیں

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۵۹۶)

ویما کی نظر میں وہی انسان زندہ ہے جو خدا کی یاد میں محو ہو کر زندگی بسر کرتا ہے۔ جبکہ پنڈت اور جھوٹے سادھو عوام کو لوٹا کرتے ہیں ان کے متعلق کہتا ہے۔

ویدوں اور شاستروں کے سنانے سے

کیا تم بہتر ہو جاتے ہو

تم گھر گھر پھر کر آخر مر جاتے ہو

خدا کی بڑائی اور عظمت کو جانو

اس طرح تم حقیقت میں زندہ رہ سکو گے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۵٦٨)

علم ایک صحرا ہے۔ بغیر رہنما کے کسی کو نہ راستہ ملتا ہے، نہ ہی وہ منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ اسی لیے تاریخ کی بیشتر مشہور شخصیتیں کسی نہ کسی استاد کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اور یہ فطری تقاضا بھی ہے۔ مگر اسکے لئے ضروری ہے کہ رہنما، کامل اور سچا ہو اور طالب علم وفادار۔ ویمنا کی زندگی میں رہنما کا اہم مقام ہے اور وہ ان کی عزت کرتا ہے اس کا کہنا ہے کہ رہنما کے بغیر زندگی کی نجات نہیں ہے۔ استاد ہی زندگی کے حقائق سے آگاہ کراتے ہیں اور یہی علم حقیقی کا ذریعہ ہیں۔ صرف مقدس کتابوں کے مطالعہ سے حقیقی علم حاصل نہیں ہو سکتا، لکھتا ہے۔

گو اس نے سب کچھ پڑھ لیا

جو علم سے تعلق رکھتا ہے

مگر وہ ایک کج بحث بن کر رہ گیا ہے

اس فریبی کو کوئی خوشی حاصل نہ ہوگی

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۴٧۴)

ویمنا کا ماننا ہے کہ ایک سچا استاد ہی حقیقی علم کو عطا کر سکتا ہے۔ جو لوگ خود پر اعتماد کرتے ہیں اور استاد کے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

یہ لوگ اپنے اوپر اعتماد رکھتے ہیں

اور استاد کی نہیں سنتے

جو انھیں نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۳۸۱)

اُستاد اور شاگرد کے رشتے کو ویمؔا نے بڑی خوب صورتی سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

استاد سب کی جڑ ہے

اور شاگرد شاخیں ہیں

دنیا میں سچے استاد کو

لوگ بہت کم پہچانتے ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۳۹۲)

سچا رہنما ایک وفادار شاگرد کی تلاش میں رہتا ہے اور اسے علمِ حقیقی سے آراستہ کراتا ہے۔ جب علمِ حقیقی سے رشتہ جڑتا ہے تو تمام پریشانیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ویمؔا کے پدوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک سچا متلاشیٔ حق تھا۔ اور اس نے انسان کے بےچینی کو دور کرنے کے لئے حق کی شناخت کو ضروری سمجھتا ہے اور کہتا ہے۔

ہم مایا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں

زنجیر بنی ہیں ہماری خواہش

ہمارے کھوکھلے قانون ہمیں جکڑ ہوئے ہیں

اس غلامی سے نجات تب تک نہ مل سکے گی

جب تک انسان زندگی کے بھید کو نہ جان لے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۱۲)

ویما کا کہنا ہے کہ خدا کی پہچان ہی زندگی کی پہچان ہے اور خدا کو پہچان لینے سے زندگی کی تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔لکھتا ہے۔

زندگی کے بھید کو جان لے
روح کو جسم سے جدا ہونے سے پہلے
تو خدا کو پہچان لے
حکمت کی روشنی سے اندھیرا دور ہو جائے گا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۴۳۳)

ویما کے نزدیک زندگی کا عین مقصد خدا کی پہچان ہے۔اور خدا انسان میں پایا جاتا ہے۔ ویما ایک موحد انسان تھا جس نے ایک خدا کی پرستش کی تھی۔اور وہی اس کا مذہب تھا۔ادویتا مسلک کو ماننے والے برہما کو خدا مانتے تھے جبکہ واشنوی، وشنو بھگوان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ویرشیوی شیو کی پوجا میں محو تھے۔ان تینوں سے مخاطب ہو کر ویما توحید کی تعریف یوں کرتا ہے۔

برہما کو فنا کر دو اور اسے وشنو میں ملا دو
وشنو کو فنا کر دو اور اسے شیو میں ملا دو
شیو کو فنا کر دو اور اسے خود میں ملا ڈالو
یہی ایک سچے یوگی کی پہچان ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۴۱۱)

ویما دنیا کی ہر شی میں خدا کی وحدانیت کو محسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اجسام الگ ہیں مگر جان ہے ایک

غذا الگ ہے مگر بھوک ہے ایک

زبانیں الگ ہیں مگر خیال ہے ایک

زیورات الگ ہیں مگر سونا ہے ایک

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۸۳)

ویمانے کئی خداؤں کے تصور پر کھل کر تنقید کی ہے۔ وہ صاف صاف الفاظ میں انسانوں کے مالک کا ذکر یوں کرتا ہے۔

کُل انسانوں کا مالک صرف ایک ہی ہے

جو دنیا پر حکومت کرتا ہے

کیا دوسرے دیوتاؤں کا

احترام واجب ہے؟

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۴۸۴)

خدا کے تخیل کے متعلق عوام میں جو جھوٹے نظریات موجود تھے ان کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

خدا کا یہ تخیل کہ وہ زمیں یا لوہے

یا لکڑی یا پتھر' یا منقش دیواروں

یا مورتیوں میں موجود ہے' غلط ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۲۰)

بت پرستی اور خدا پرستی کی اصلیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

وہ لوگ جو دل میں خدا کے موجود ہوتے

اس سے بے خبر ہیں اور پتھروں کے سامنے

سر جھکاتے ہیں، جانور ہیں

کیا زندہ معبود کے مقابلے میں پتھر بہتر ہے؟

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۸)

ہر مذہب کا یہی آخری پیام ہے کہ وہ خدا کی عبادت کرے انسانی اقدار کو قائم رکھے اور ایک بہتر انسان ہو کر زندگی گزارے۔

ویمنا کی شخصیت اعلیٰ انسانی اوصاف کا مجسمہ تھی۔ اس نے اپنے مخصوص اسلوبِ بیان سے دنیا کو انسانی قدروں سے روشناس کیا ہے۔ وہ ایک انسانیت کا پیام بر تھا، جس نے انسانی اقدار زندہ وہ جاوداں رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ ویمنا کے دور میں ذات پات کا اثر عروج پر تھا۔ لوگ علم و قابلیت کے بجائے انسان کی ذات و مذہب کو دیکھتے تھے۔ ویمنا نے اس اونچ نیچ اور فرقہ واریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کا کہنا ہے کہ سب انسان برابر ہیں اور اخلاق ہی کی عمدگی سے انسان کا رتبہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر اخلاق نہ ہوں تو وہ انسان بدتر ہے، ویمنا کہتا ہے۔

بغیر یکسوئی کے عبادت بیکار ہے

بغیر اخلاص کے کہنا بیکار ہے

بغیر اخلاق کے ذات بیکار ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۱۸)

ویمنا نے انسانی تہذیب پر زور دیتے ہوئے صاف کر دیا ہے کہ انسان کی قسمت کا فیصلہ انسان کے اعمال میں پوشیدہ ہے۔ انسانی ترقی اعمال کی تربیت کی وجہ سے ہے۔ اور اعمال کی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان خود سے آشنا نہ ہو۔

انسانی تہذیب انسان کے مرتبے کا تعین کرتی ہے۔ ویما کا قول ہے۔

دنیا کا سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو حق جانتا ہے

بڑائی کا چرچا وہی کرتا ہے جو متوسط درجہ کا انسان ہے۔

سب سے گرا ہوا انسان وہ ہے جو اپنا

پیٹ پالنے کی خاطر مذہبی لباس پہنتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۴۶۲)

انسان اعلیٰ ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے انسانی جوہر سے آگاہ ہو جائے۔ ویمنا اعلیٰ انسان کے متعلق اپنے خیالات کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

سب سے اعلیٰ انسان وہ ہے

جو سکونِ قلب حاصل کر چکا ہو

وہ اپنے مذہب کا پابند ہو

دوسرے مذہبوں کو بُرا بھلا نہ کہتا ہو

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۸۵)

دل پر قابو پانا بھی ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ ویمنا اپنے اس خیال کی تشریح یوں کرتا ہے۔

جس نے آج یا کل یا پرسوں تک

یہ سیکھ لیا ہو کہ

دل پر قابو کیسے پایا جاتا ہے

وہ انسانوں میں سب سے بہتر ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۴۵)

ویمنا ایک بہتر سماج کا خواب دیکھتے ہوئے لوگوں کو نیک راہ پر چلنے کی تاکید کرتا ہے۔ ویمنا کا کامل انسان' دراصل انسانی بزرگی کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ وہ کامل انسان کی تعریف یوں کرتا ہے۔

وہ انسان کامل ہے جس نے
دن اور رات
اپنے اور پرائے میں
فرق نہ کرتا ہو۔

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۱۰)

اور

انسانوں میں وہی بزرگ ہے
جو جانتا ہو اس کا دل خدا کا گھر ہے
جس نے خود کو جان لیا
وہ خدا کو پالیا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۵۵۵)

ویمنا بحیثیت مصلح قوم لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ اخلاق کو جگہ دیں اور نیک انسانی اوصاف پیدا کریں۔ جب تک نیک لوگ بروں کو معاف نہیں کرتے اور برے نیک لوگوں کے احسان مند نہیں رہتے، ایک اچھے سماج کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ ویمنا ایک نیک انسان کے اوصاف کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ دوسروں کی برائیوں کو نظر انداز کر کے بھلائیوں کو یاد رکھے لکھتا ہے۔

ہر قسم کا جھگڑا اور دوسروں کے عیب

انسان کو بھول جانا چاہیے

لیکن اس بھلائی کو نہیں بھولنا چاہیے

جو ہمارے ساتھ کسی دوسرے نے کی ہو

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۱۵۲)

اسی اصول پر چل کر ایک گناہ گار نیک انسان بن سکتا ہے۔ نیکی انسانی برتری ہے۔ ویمنا اس نسان کو برتر نہیں سمجھتا جو اونچی ذات میں پیدا ہوا ہو۔ اس کا ماننا ہے کہ انسان کے اخلاق اور اس کی نیکیاں ہی اس کی برتری کا جواز ہیں۔ اس خیال کو ویمنا نے یوں ظاہر کیا ہے۔

برتری کا انحصار پیدائش پر نہیں

بلکہ نیکی پر ہے

زندگی کا تمام اثاثہ

انسان کی نیکیاں ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۶۲)

نیک اعمال کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

اگر کوئی کام نیک نیتی سے کیا جائے تو

خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو

حقیر تصور کیا نہیں جا سکتا

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۶۰۳)

ویمنا کا ماننا تھا کہ ساری دنیا کے انسان ایک ہیں۔ کوئی اعلیٰ و کم ذات نہیں ہے۔ کوئی

اچھوت نہیں ہے۔ ویمآ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتا ہے کہ جس میں کوئی تفرقہ نہ ہو۔ سب ایک ہوکر زندگی بسر کریں۔ اس خیال کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

سب کو کھانا پروسو، ساری دنیا کے لوگوں کو

ایک تھالی میں سب مل بیٹھ کر کھائیں گے

بھول جائیں گے سارے امتیازات

سب جئیں گے ایک ہوکر

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص: ۷۷)

اختتامیہ:۔

ویمآ 'یا ویمنا' تلگو کا مشہور عوامی شاعر ہے جو ۱۶۵۰ء سے ۱۷۵۰ء کے درمیان پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ آندھرا کے علاقہ رائل سیما میں گزارا۔ وہ ذات سے کاپو کسان تھا۔ کٹھار پلی میں دفن ویمآ لنگا دیما ہے۔ زیرِ مطالعہ ویمآ نہیں۔

ویمآ کا دور سیاسی انتشار کا شکار تھا۔ سماج میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ مذہب منافقانہ طریقۂ عمل کا نام تھا۔ اور ادب تفریح کا ایک ذریعہ۔ اس پس منظر میں ویمآ نے اپنی سچی اور سادہ شاعری کا آغاز کیا اور تلگو شاعری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کرایا، جس میں سماجی حقائق اور زندگی کی چاشنی تھی۔

ویمآ کی زندگی کے تعلق سے جو کہانی پورنیا چاری نے بتائی ہے وہ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں اس میں غیر حقیقی واقعات پائے جاتے ہیں۔ ویمآ کی عیاش زندگی، اور اس کا یوگی ہونا اس کی شاعری سے ثابت ہوتا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کہانی میں کچھ حد تک حقیقت پائی جاتی ہے۔

ویما کی زندگی کو اس کی شاعری سے ڈھونڈ نکالا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سترھویں صدی میں آندھرا کے علاقہ رائل سیما کے ایک امیر کاپو کسان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم پنڈتوں کے ہاں حاصل کی تھی ۔ اور وہیں شاعری کی مشق بھی کی تھی ۔ رامائن، مہابھارت وغیرہ شاستروں کے قصہ بڑے غور سے سنے تھے۔ نوعمری میں ماں کے مرجانے سے سوتیلی ماں کی بے رحمی کا شکار ہوا۔ باپ کی توجہ نہ ہونے پر ویما دیوداسیوں سے تعلقات قائم کرتا ہے ۔ اور ان پر پیسہ لٹانے لگتا ہے ۔ ویما کی شادی ہوتی ہے ۔ مگر وہ اپنی گھریلو زندگی میں کامیاب نہ ہوا۔ اور نہ ہی وہ اپنی اولاد سے خوش تھا۔ ویما کی مالی حالت کمزور ہو جانے سے اس کی گھر میں اور باہر کوئی عزت نہیں رہتی ہے ۔ وہ زندگی سے اوب جاتا ہے ۔ اور سارے بندھنوں کو توڑ کر حقیقت کی تلاش میں نکل پڑتا ہے ۔ بہت سے پنڈتوں اور یوگیوں سے حق جاننے کی کوشش کرتا ہے، مگر مایوس لوٹتا ہے ۔ کسی یوگی کی ملاقات سے ویما کی زندگی میں انقلاب آتا ہے ۔ ویما علمِ حقیقی سے فیض یاب ہونے کے بعد لوگوں کو زندگی کے حقائق بیان کرتا پھرتا ہے ۔ اور گم نامی میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔

ویما کی شاعری میں اس کی شخصیت پوشیدہ ہے ۔ ویما کے کلام کی شدت اور بے باکی ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک جذباتی اور باغیانہ طبیعت کا مالک تھا۔ زندگی کے حالات نے ویما کو عیاش بنا دیا اور ساتھ ساتھ عورتوں کا منکر بھی۔ اس کا ماننا تھا کہ عورت ہر فساد کی جڑ ہے ۔ ویما خود کسان ہونے کے علاوہ غریب کسانوں کا ہمدرد تھا۔ وہ امیروں سے کہتا ہے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرے ۔ ویما ہمدرد انسان ہونے کے علاوہ حقیقت پسند انسان تھا جس نے زندگی کے حقائق کو فطرت کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی تھی ۔ توہم پرستی کی مخالفت کے علاوہ اس نے جھوٹے پنڈتوں پر کھل کر تنقید کی ہے ۔ مگر وہ ایک سچے رہنما کا قائل تھا۔ ویما کا یقین تھا کہ بغیر رہنما کے منزل مقصود حاصل نہیں ہوسکتی ۔

ویما ایک سچا متلاشی حق تھا جو توحید کے راستہ پر ثابت قدم تھا۔ ایک خدا پر اس کا کامل ایمان تھا۔ اس نے کئی خداؤں کے تصور کو اور بت پرستی کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کا پیام اعلی انسانیت کا پیام تھا' بلکہ وہ ایک انسانیت کا پیام بر تھا۔ جس نے خدا کو انسان میں تلاش کرنے کا سبق پڑھایا تھا۔

بابِ سوّم

امجد حیدرآبادی اور تصوف

حضرت امجؔد کی نظم ہو یا نثر دونوں میں تصوف اور معرفت کا عنصر غالب ہے۔ اگر آپ کی تحریروں سے اس عنصر کو الگ کر دیا جائے تو آپ کی تخلیقات بے نور ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ آپ کا مخصوص عارفانہ طرز ہی ہے جو آپ کی تحریروں کو منور اور موثر بناتا ہے۔

حضرت امجؔد نے نثر کے مقابلہ میں نظم کو اور نظم میں علی الخصوص رباعی گوئی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ چناں چہ ہم اس باب میں رباعیاتِ امجؔد کے حوالہ سے آپ کی متصوفانہ شاعری کا جائزہ لیں گے۔

حضرت امجؔد ایک صوفی صافی اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رباعیات کا خاص موضوع تصوف اور معرفت رہا ہے۔ یہ رباعیات آپ کے خالص روحانی جذبات اور گہرے مشاہدات کی سچی ترجمانی کرتی ہیں۔ روحانی صداقت اور عارفانہ حقائق کی بنا پر آپ کی رباعیات فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر صوفی سرمؔد کی رباعیات سے ٹکر لیتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُس دور کے ادیبوں نے آپ کو سرمؔدِ ثانی' اور "جواب سرمؔد" کے القاب سے نوازا تھا۔ اس بات کا آپ کو بھی احساس تھا۔

سید احمد حسین امجؔد ہوں میں
امجؔد ہوں جواب سرمؔد ہوں میں
کوندی ہوئی ہے نور سے مٹی میری
خاکِ قدم پاک محمدؐ ہوں میں

دراصل حضرت امجد کے نزدیک مذہب ہو یا فلسفہ' عشق ومحبت ہو یا پھر اور کوئی موضوع ہر جگہ ان کے خیالات ایک سچے صوفی کی طرح واضح ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام شاعر کا کلام نہیں بلکہ ایک صوفی کا کلام ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون " حضرت امجؔد کی سیرت کی ایک جھلک" میں لکھا ہے۔

''امجد صاحب ایک شاعر تھے' ایک صوفی بھی۔ شاعر اور صوفی کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہر صوفی شاعر نہیں ہوتا ہے اور نہ ہر شاعر صوفی ہوتا ہے۔ شاعر تخیل کی نگرانی میں رہنے والا' افکار کی بوقلمونی میں حیران شعر کی دھن میں رہنے والا' مبالغہ کی دنیا میں بسنے والا ہوتا ہے۔ اور صوفی اللہ سے دل لگاتا ہے۔ ذاتِ وحدۃ لاشریک کی یاد میں مگن رہنے والا' ہر حق پر عمل کرنے والا ہوتا ہے۔ امجد صاحب دونوں تھے۔ شاعر بھی اور صوفی بھی۔ اس لئے آپ کی شاعری کا خاص رنگ رہا ہے۔ نظمیں ہوں یا تضمین' غزلیات ہوں یا رباعی ہر ایک میں قرآن کی تفسیر' قرآن کی نصیحتیں' قرآن کی باتیں ملتی ہیں۔ آپ کی شاعری سے بخوبی واضح ہوتا ہے ان کا خالق شاعری کے ساتھ بڑا صوفی بڑا سالک ہے۔''

(امجد نمبر، ص:۴۱)

سلام سندیلوی نے بھی اپنے ایک مضمون میں حضرت امجد کو تصوف کی وادی کا خضر کہا ہے۔

''جس طرح جوش ملیح آبادی انقلاب و شباب کے پیغمبر ہیں اور فراق گورکھپوری سنگار رس کے میر میکدہ ہیں' اسی طرح امجد حیدر آبادی تصوف کی وادی کے خضر ہیں۔''

(امجد نمبر:۶۵)

چناں چہ حضرت امجد کے کلام میں جابجا تصوف کے ایسے عناصر اور افکار دیکھنے میں آتے ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے وقت کے ممتاز صوفی شاعر تھے۔

غرض تصوف و معرفت سے بھرے حضرت امجدؔ کے کلام کو سمجھنے سے پہلے تصوف کے معنی و مفہوم کو سمجھ لینا ضروری ہے تا کہ آپ کی شاعری کی انفرادیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

تصوف کی تعریف:

تصوف عربی زبان کا لفظ ہے ۔ یہ لفظ'' صوف'' سے نکلا ہے، جس کے معنی ''اون'' کے ہیں۔ عربی لغت کی رو سے لفظ تصوف کے معنی ''اس نے لباسِ صوف (اون) پہنا'' کے ہیں ۔صرف صوف پوشی ہی سے تصوف کی جامع تعریف نہیں ہوسکتی۔ تاہم اکابر علماء وصوفیاء کے قابلِ ذکر اقوال سے علم تصوف کی جامع تعریف ہوسکتی ہے۔ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ

> ''تصوف وہ علم ہے جس سے تزکیہ نفوس، تصفیۂ اخلاق، تعمیر ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہوتا ہے تا کہ سعادتِ ابدی حاصل کی جا سکے۔ اس کا موضوع بھی تزکیہ وتصفیہ اخلاق وتعمیر ظاہر و باطن ہے اور اس کی غایت و مقصد سعادتِ ابدی حاصل کرنا ہے''

(قرآن اور تصوف: ص: ۱۱)

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

> ''جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیہ کے طریقہ کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے ۔ ان کے علم کا حاصل نفس کی گھاٹیوں کو قطع کرنا، اخلاقِ ذمیمہ اور صفاتِ خبیثہ سے پاک و منزہ ہونا ہے۔ تا کہ اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ سے خالی کیا جائے اور اس کو

ذکرِالٰہی سے آراستہ کیا جائے''

(کتابِ مذکور، ص:۱۲)

علمِ تصوف سے آپ اس قدر متاثر تھے کہ اپنی شہرت کے عروج کے زمانہ میں تصنیف وتدریس کو چھوڑ کر انہوں نے صوفیاء کا طریقہ اختیار کیا اور جنگلوں میں پھرا کئے۔

تعمیر باطن پر زور دیتے ہوئے معروف کرخیؒ تصوف کی تعریف میں فرماتے ہیں:

''تصوف حقائق کی گرفت اور خلق سے مایوس ہے۔ جب صوفی پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نافع وضار حق تعالیٰ ہی ہیں تو پھر وہ ماسوائے حق سے نابینا ہو جاتا ہے۔ اور غیر حق کے لئے نہ جود و زیاں ثابت کرتا ہے اور نہ منع و عطا۔ بلا و عطا میں خدا ہی کو فاعل سمجھتا ہے اور اسباب و سائط کے لئے کوئی مستقل ہستی نہیں قرار دیتا''۔

(کتابِ مذکور، ص:۱۵)

غرض تصوف کی ان تعریفوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم صرف تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق ہی کی حد تک محدود نہیں، بلکہ معرفتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ علمِ قرب بھی عطا کرتا ہے۔

جس طرح ''تصوف'' کے لفظی معنی سے اس کی صحیح تعریف نہیں ہو سکتی اسی طرح لفظ ''صوفی'' کے لفظی معنٰی کے تعلق سے بھی علمائے دین میں اختلاف رائے ہے۔ ابنِ خلدون کا خیال ہے کہ صوفی وہ ہے جو لباس صوف (اون) پہنتا ہو۔ بعض لفظ ''صوفی'' کو ''صفا'' سے مشتق خیال کرتے ہیں، یعنی صوفی وہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے صفائی قلب سے زینت بخشی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ صوفی وہ صحابہ ہیں جنہوں نے مسجد نبوی (صفہ) کو اپنی قیام گاہ بنالی تھی اور دنیوی تعلقات کو ترک کر کے فقرالی اللہ اختیار کر لیا تھا۔

علامہ لطفی جمہ صوفی کا لفظ ''شوفیا''(sophia) سے منسوب کیا ہے۔ جو ایک یونانی کلمہ ہے اور جس کے معنی ''حکمتِ الٰہی'' کے ہیں۔ یعنی صوفی وہ حکیم ہے جو حکمت الٰہی کا طالب ہوتا ہے۔

(کتابِ مذکور، ص: ۷، ۸، ۹)

مذکورۂ بالا کے آراء سے صوفی کی جامع تعریف نہیں ہوتی ہے۔ تاہم زمانۂ جدید کے علماء نے صوفی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ابوالحسن نوریؒ لکھتے ہیں:

''صوفی ہویٰ وحوس سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو علم اللہ کے تابع کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی ہویٰ فنا ہو جاتی ہے، وہ واقف ہے کہ اتباعِ ہویٰ ضلالت ہے۔''

(کتابِ مذکور، ص: ۱۳)

حضرت جنیدؒ نے صوفی کی تعریف اس طرح کی ہے:

''صوفی فانی زخویش و باقی بہ حق ہوتا ہے، وہ اپنی قیومیت ذاتیہ سے فانی ہو کر حق تعالیٰ کی قیومیت (ہویت وانا) سے باقی ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذات سے میت ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی ذات سے اس کو بقا حاصل ہوتی ہے۔''

(کتابِ مذکور، ص: ۱۴)

حسین بن منصورؒ نے صوفی کی تعریف یوں کی ہے۔

''صوفی وحدانی الذات ہوتا ہے۔ نہ اس کو کوئی قبول کرتا ہے اور نہ وہ کسی کو قبول کرتا ہے، اس کی بصر اور بصیرت میں اللہ من حیث الظاہر اور اللہ من حیث باطن بس جاتا ہے، وہ غیر اللہ سے منقطع ہو جاتا ہے۔'' (کتابِ مذکور، ص: ۱۴)

غرض تصوف اور صوفی کی ان تعریفوں پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم صرف تزکیہ نفس اور تصفیۂ اخلاق ہی کی حد تک محدود نہیں بلکہ یہ ''علم قرب'' بھی عطا کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر صوفی اپنے آپ کو حق تعالی کے حوالے کر دیتا ہے' اور اس کا ہر عمل اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے۔ صوفی نہ صرف سیر الی اللہ کا علم رکھتے ہیں، بلکہ اپنے وجود کی نفی کر کے اللہ کا وجود رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو اپنے سے قریب و اقرب پاتے ہیں۔ اسے اپنا ظاہر و باطن پاتے ہیں' اول و آخر پاتے ہیں' اور کائنات کی ہر شئے میں حق کو دیکھتے ہیں۔ صوفی کا مقصد اللہ' مطلوب اللہ اور محبوب اللہ ہوتا ہے۔ اس کا جینا' مرنا' اس کی فکر' اس کی عبادت یہاں تک کہ اس کا ہر فعل صرف اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے۔

تاہم علم تصوف اور صوفی کے تعلق سے یہ عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ یہ قرآن و سنت کی چیز نہیں ہے۔ اور اس کا تعلق غیر اسلامی فلسفہ سے ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب اپنی مشہور تصنیف' قرآن اور تصوف'' میں اس تعلق سے طویل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تصوف قرآن و سنت ہی کا روحانی حصہّ ہے۔ علاوہ ازیں مولانا محمد منظور نعمانیؒ دین کے تین شعبوں :۔ ایمان' اعمالِ صالحہ اور روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیۂ اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''جن لوگوں کی کتاب و سنت پر کچھ نظر ہے وہ اس بات سے ناواقف ہو سکتے کہ رسول اللہ نے جس طرح ایمانیات و اعتقادات اور عبادات اور آدابِ معاشرت و معاملات کے ابواب میں اپنی تعلیم و ہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اسی طرح آپ نے اللہ تعالی کی محبت اور خشیت' یقین' توکل' احسان و اخلاص جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات کے متعلق بھی اہم ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلی' اور مثالی نمونہ امت کے لئے چھوڑا ہے۔ یہی تصوف و

سلوک کا خاص موضوع ہے''

(تصوف کیا ہے، ص:۲ اور ۳)

چناں چہ تصوف، مذہبِ اسلام ہی کا حصہ ہے، جس میں روحانی تعلیم کا درس دیا جاتا ہے۔ اور جو صوفی قرآن وسنت کی روشنی میں روحانی تعلیم دیا کرتے ہیں وہ حق پر قائم ہیں۔

امجدؔ اور تصوف:

حضرت امجدؔ ایک صوفی شاعر تھے، اور تصوف کا گہرا علم رکھتے تھے۔ آپ کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ یہ کوئی عام شاعر کا کلام نہیں بلکہ ایک صوفی شاعر کا کلام ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تصوف کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری تصوف و معرفت کے نور سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت ایک سچّے صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باعمل انسان بھی تھے، جو شریعت کے پابند تھے۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعۂ عوام کو معرفتِ الٰہی کے باب پڑھائے ہیں، تصوف کے دیگر مسائل کی وضاحت کی ہے، مذہب کی اہمیت کو بیان کرنے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی تعمیر اور انسانیت کا احترام کرنا بھی سکھایا ہے۔

معرفتِ الٰہی:

حضرت امجدؔ ایک صوفی ہیں، جو صرف اور صرف معرفتِ الٰہی کی محبت میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کو سمجھنا اور اس کو پانا ہی ان کی زندگی کا مقصد عین رہا ہے۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں۔

ہر وقت ہے لب پہ گفتگوئے مقصود\
لیکن نظر آتا نہیں روئے مقصود

کیا تم سے بتاؤں زندگی کا مقصد

ہے مقصدِ زیست جستجوئے مقصود

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:٦٢)

لیکن خدا کی ذات کو دیکھنے کے لئے نہ انسان کی بینائی مدد دے سکتی ہے اور نہ عقل وخرد کے ذریعہ اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کائنات کا گہرا مطالعہ اور خودشناسی ہی کے ذریعہ اس کے وجود اور کبریائی کی پہچان ہو سکتی ہے۔

صوفیا، حق کی پہچان ہی کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ مخلوق میں خالق کا پرتو دیکھتے ہیں۔ وہ مخلوقات پر غور کر کے خالق کو دریافت کرتے ہیں۔ خارجی نشانیوں کے ذریعہ داخلی حقیقتوں کو جان لیتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ کی یاد میں رہتے ہیں اور ایسی باتیں محسوس کرتے ہیں، جو ایمان و یقین میں اضافہ کرنے والی ہوتی ہیں۔

بحیثیتِ صوفی شاعر، حضرت امجد نے معرفتِ الٰہی کے متعلق کئی رباعیاں کہی ہیں۔ ان رباعیات میں آپ نے خدا کے وجود اور اس کی خدائی کو اس قدر پُر زور دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ دلِ منکر بھی نورِ ایمان سے لب ریز ہو جاتا ہے۔ ذیل کی چند رباعیاں اس بات کی شاہد ہیں:

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے

ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے

ہر اصل، اصولِ معرفت ہے یا رب

پتّا پتّا تیرا پتہ دیتا ہے

(امجد نمبر ص:٥٩)

بجتا ہو ستار اور مضراب نہ ہو
پھیلی ہوئی چاندنی ہو مہتاب نہ ہو
میں میں نہیں ہوسکتا نہ ہوتو جب تک
ممکن ہی نہیں جباب ہو آب نہ ہو

(رباعیاتِ امجد حصہ دوم،ص:۵)

خالق ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے
انت کے لئے اپنا انا شاہد ہے
اس پر بھی اگر کوئی نہ مانے نہ سہی
خود اپنے وجود پر خدا شاہد ہے

(رباعیاتِ امجد حصہ دوم،ص:۱)

معرفتِ الٰہی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ قرآن میں آتا ہے کہ اللہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ دل خدا کا گھر ہے۔ حضرت امجدؔ کی بیشتر رباعیوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے خود میں خدا کی جھلک دیکھی ہے' اور وہ خدا کے بالکل قریب ہیں۔

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں
اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے
دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں

(رباعیاتِ امجد حصہ اول ،ص:۹)

خدا سے ہم کلامی کی کیفیت کو ایک رباعی میں یوں پیش کیا ہے۔

یہ کیا میرے روبرو ہے معلوم نہیں
میں کون ہوں کون تو ہے معلوم نہیں
ہوتی رہتی ہیں دل ہی دل میں باتیں
کس سے یہ گفتگو ہے معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد حصہ دوم، ص:۸۸)

ایک اور رباعی میں قربِ الٰہی کے احساس کو یوں ادا کیا ہے۔

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں
باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک
کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں

(پیامِ امجد، ص:۳۵)

صوفیا کرام، دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا کر صرف خدا سے لو لگائے رہتے ہیں، اور اسی میں لطف پاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب اللہ والے اللہ کی محبت میں اس کا قرب حاصل کر لیتے ہیں تو وہ دنیا کے ہر فکر و خوف سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ خدا کے ہو جانے میں جو ابدی لذت انہیں حاصل ہوتی ہے، اس کا ذکر حضرت امجد یوں کرتے ہیں:

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو
جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو

کیا عرض کروں اس میں کیا لذت ہے

اک مرتبہ تم اک کے ہو کر دیکھو

(جمالِ امجد، ص:۱۴۵)

یہ ایک صوفی کی پہچان ہے کہ وہ ہر وقت قربتِ خداوندی کو محسوس کرتا ہے۔ قربِ الٰہی کے دوران جو کیفیات و تجربات پیش آتے ہیں اس کا ذکر حضرت امجدؔ نے مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو چند رباعیاں

چھپنے کا عجب ڈھنگ نکالا اس نے

کیا کام کیا ہے بالا بالا اس نے

اپنی بے پردگی چھپانے کے لئے

میری آنکھوں پر پردہ ڈالا اس نے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۱۸)

کیا جانئے وہ نور تھا یا سایہ تھا

شعلہ سا کسی نے دل میں بھڑکایا تھا

آیا کس وقت یہ معلوم نہیں

جاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آیا تھا

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۵۹)

یہ اور اس طرح کے کئی رباعیات ہیں جن میں حضرت امجدؔ نے معرفتِ الٰہی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی شاعری میں معرفت کے مسئلوں کا حل ملتا ہے۔

ہر مرتبہ آئینہ دل دھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۱۸)

معرفتِ الٰہی کے نور سے بھری یہ رباعیاں آپ کے پاکیزہ جذبات اور روحانی کیفیات کی آئینہ دار ہیں، جس کا اثر ہر خاص و عام پر ہونا لازمی ہے۔ خود حضرت امجدؔ کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ اس لئے فرماتے ہیں:

ہر نقطہ و حرف کام کر جاتا ہے
دامنِ گل معرفت سے بھر جاتا ہے
امجدؔ کا کلام کوئی خنجر تو نہیں
کیوں دل میں ہر ایک کے اتر جاتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۵۲)

مسائل تصوف:

حضرت امجدؔ ایک صوفی شاعر تھے اور علمِ تصوف کا گہرا علم رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے تصوف کے اسرار، روحانی کیفیات اور وارداتِ قلبی میں ڈوب کر شاعری کی تھی۔ ان کا کلام ان کے پاکیزہ جذبات اور حقائقِ معرفت کی ترجمانی کرتا ہے۔ نیز انہوں نے مسائلِ تصوف، مثلاً (مسئلہ) وحدت الوجود، مسئلہ وحدت الشہود، ہمہ اوست، ہمہ از اوست، جبر و اختیار وغیرہ کی شاعرانہ وضاحت

بھی کی ہے۔آپ کے کلام میں ان مسائل کا ذکر بڑے ہی دلچسپ اور عام فہم انداز میں ملتا ہے۔ذیل میں ان مسائل کا ہم تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔

وحدت الوجود:

علمِ تصوف کا ایک اہم مسئلہ وحدت الوجود ہے۔اس مسئلہ کو سمجھنے اور اپنے باطن میں انگیز کرنے والے کو موحد کہتے ہیں۔ جو خدا کی وحدانیت کو کائنات کی ہر شئی دیکھتا ہے۔ ایک موحد کی طرح حضرت امجدؔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کی وحدانیت کو دیکھ لیتے ہیں۔مثال کی طور پر ذیل کی چند رباعیاں ملاحظہ ہو:

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے اکائی دیکھو

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۳۰)

انسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک
گو حروف کثیر ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالم کثرت کا ہے منشا واحد
اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۳۱)

ہر رنگ میں بے رنگ کی صورت دیکھی
پتھر میں شعلہ کی لطافت دیکھی

واحد سے ہوا ہمیشہ واحد کا صدور

کونین میں وحدت ہی کی کثرت دیکھی

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۵۰)

یہ نظر دنیا میں کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

وحدت الشہود:

مسئلہ وحدت الشہود کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا وجود' واحدِ مطلق کی ذات وصفات کا ظل یا عکس ہے۔ اس مسئلہ میں خدا اور بندہ کے وجود کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ حضرت امجدؔ نے اس مسئلہ کی توضیح بڑے ہی شاعرانہ وحکیمانہ انداز میں کی ہے۔

ذیل میں ان کی چند مثالیں پیش نظر ہیں۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی

ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی

یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں

ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۶۹)

اس پھول کا رنگ اڑ جائے بو رہ جائے

سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے

ثابت ہو میری نفی سے تیرا اثبات

میں اتنا مٹوں کے صرف تو رہ جائے

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۴)

میں قلزم ذخار ہوں منبع تو ہے
میں مہر جہاں تاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں
مانند ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے

(رباعیاتِ امجد،حصہ دوم،ص:۳۶)

مجھ میں ہے چھپی ہوئی کوئی شئی تیری
نغموں میں میرے ضرور ہے لئے تیری
صورت سے تو آشنا نہیں ہیں آنکھیں
آواز کہیں سنی ہوئی ہے تیری

(رباعیاتِ امجد،حصہ دوم ،ص:۶)

ہمہ اوست:

تصوف کا ایک اہم مسئلہ' ہمہ اوست ہے' جس کا مفہوم ہے' جس کا مفہوم ہے' خدا کے سوا کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ یہ خدا ہی ہے جو مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ اس مسئلہ کے تحت عاشق کو خدا کا جلوہ ہر شئے میں نظر آتا ہے۔ ذیل کی رباعیوں میں حضرت امجدؔ نے اس مسئلہ کی شاعرانہ توضیح ملاحظہ ہو۔

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست
گرداب' حباب' موج سب پانی ہے

(رباعیاتِ امجد،حصہ اول ،ص:۲۹)

حسن مطلق مقدر طور نہیں
خورشید کا عالم میں کہاں نور نہیں
مخلوق سے کچھ الگ نہیں ہے خالق
معنیٰ کا وجود لفظ سے دور نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۳۴)

اس عظمِ رمیم سے ہما ہی نکلا
دل بندہ کا چیرا، تو خدا ہی نکلا
قائم رہی بےخودی میں بھی شانِ خودی
الٹا بھی انا کو تو انا ہی نکلا

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۶۰)

ہمہ ازاوست:

مسئلہ ہمہ ازاوست کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام چیزیں خدا سے ہیں۔ کوئی چیز بذاتِ خود موجود نہیں: بلکہ ہر شئے اپنی ہستی کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ اس مسئلہ پر بھی حضرت امجد نے کئی ۔باعیاں کہی ہیں۔ چند ایک یہاں درج کی جاتی ہیں۔

یہ فکر کسی دماغ سے نکلی ہے
یہ مئے بھی کسی ایاغ سے نکلی ہے
تو نور ہی نور میں سراپا ظلمت
کالک بھی مگر چراغ سے نکلی ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۴۶)

عارض ہو کہ خط و خال میرا کب ہے

نقصان ہو یا کمال میرا کب ہے

مانا کہ میرا خیال ہی ہے سب کچھ

لیکن میرا خیال میرا کب ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۲۹)

ہر وقت فضائے دلکشا دیکھتے ہو

صحرا وچمن ارض وسما دیکھتے ہو

مخلوق میں نیرنگیٔ خالق دیکھو

قرآن پڑھو جلد کو کیا دیکھتے ہو

(رباعیاتِ امجد حصہ اوّل، ص:۱۲)

مسئلہ جبر و اختیار بھی ایک ادق مسئلہ ہے کوئی اختیار کا قائل ہے تو کوئی جبر کا۔ حضرت امجد اپنے مخصوص عارفانہ انداز میں اس مسئلہ کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔

بے کار ہوں، باکار ہوں معلوم نہیں

نادان ہوں ہشیار ہوں معلوم نہیں

تقدیر بھی حق، جزائے اعمال بھی حق

مجبور ہوں مختار ہوں معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم ،ص:۱۰۴)

اسی طرح مسئلہ تقدیر و تدبیر کے تعلق سے بھی لکھتے ہیں۔

کھیتی میرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں
تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی
یہ کیا وہ کیوں سے عقل تھکتی ہی نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:٦٧)

حضرت امجدؔ کے ہاں تقدیر کا شکوہ عبث ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے' وہ سب خدا ہی کی رضا سے ہوتا ہے۔ ایک اور رباعی میں خدا کی بے پناہ قوت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا ہوا خدا کی مرضی
امجدؔ ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:٦٩)

ان متصوفانہ رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امجدؔ کی فکر کا مرکز حق تعالیٰ ہے۔ وہی ہر شئے کی ابتداء ہے۔ وہی انتہا ہے۔ نقصان بھی اسی سے ہے اور نفع بھی اسی سے ہوتا ہے۔ مختصراً، انسان کی زندگی کی کشتی کا ناخدا، خدا ہے۔

مذہبی تعلیمات:

حضرت امجدؔ کے کلام میں نکاتِ تصوف ہی نہیں بلکہ مذہبی تعلیمات کی تلقین بھی ملتی ہے۔موصوف نے مذہبی اصول ونکات کے تقدس اور اس کی اہمیت کو اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ان کی اس نوعیت کی رباعیات میں آپ کے پاکیزہ جذبات اور روحانی کیفیات کی سچی ترجمانی ملتی ہے۔ذیل میں ان رباعیات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

انسان کے لئے خدائے واحد پر ایمان لانا اسی کی دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی کے لئے ضروری ہے ایمان کے بغیر عبادات کے کچھ معنی نہیں رہ جاتے۔حضرت امجد لکھتے ہیں:

اس دل میں ذرا یقین کی شان نہیں
کہنے کو تو زندہ ہوں مگر جان نہیں
ہے اور نہیں کے درمیان ہے دن رات
جگنو کی چمک ہے اپنا ایمان نہیں

(رباعیات امجدؔ حصہ سوم،ص: ۳۹)

خدا پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ' اس کے رسول پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، یہ مذہب اسلام کا فریضہ اوّل ہے۔حضرت امجد نے کلمہ طیبہ کی اہمیت اور حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

انسان کی زندگی کی دوسانسیں ہیں
ہر جان کی زندگی کی دوسانسیں ہیں

یہ کلمہ طیبہ کے دو جزء ہیں

ایمان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۱۷)

اسلام کا دوسرا فریضہ نماز ہے۔ انھوں نے ایک رباعی میں نماز کی عظمت کو یوں بیان کیا ہے۔

پیراہن کبر چاک ہو جاتا ہے

نفسِ سرکشی ہلاک ہو جاتا ہے

مسلم کے لئے عجیب نعمت ہے نماز

سر خاک میں رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۲۴)

حضرت امجد کی نظر ایک صوفی کی نظر تھی، وہ کائنات کی ہر شئے میں عبدیت کے پہلو کو دیکھ لیتی تھی۔ صورتِ دل کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہم ہر فطرت میں عبدیت پاتے ہیں

سب سرکسی دہلیز سے ٹکراتے ہیں

دیکھو نظرِ غور سے دل کی صورت

دو ہاتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں

(جمالِ امجد، ص:۱۲۳)

رباعیاتِ امجد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے بیشتر مذہبی رباعیات پر کلام وحدیث سے کوئی مناسب عنوان بھی درج کیا ہے۔ ''وحدہ لاشریک'' کے عنوان سے

حضرت امجد کی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے۔

بے خود میں ہوں تو وہ خریں آتا ہے
پردہ ہی میں وہ پردہ نشین آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۶۸)

آیت شریفہ ''وتعزمن تشاء وتذل من تشاء'' کے عنوان سے لکھی گئی یہ رباعی دیکھئے۔

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے **کیما** ہوتا ہے
اصنام بھی دبی زبان میں کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۶)

حضرت امجد کی رباعیات میں اللہ رب العزت کے مختلف صفات کا ذکر ملتا ہے۔ خدا پر ایمان، اس کی عظمت، وحدانیت، قیومیت، رحمت وغیرہ صفات کو آپ نے اپنے عارفانہ رنگ میں رنگ دیا ہے۔

ایمان و یقین کے دوران انسان میں خوف ورجا کی جو متضاد کیفیات ، ہوتی ہیں، انہیں کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں اور اس پہ مرتے بھی ہیں۔

شکوہ اس کے غضب کا کرتا بھی ہوں
ہر سانس میں پھر دم اس کا بھرتا بھی ہوں
مالک میں مرے مہر بھی ہے قہر بھی ہے
مرتا بھی ہوں اسی پہ اس سے ڈرتا بھی ہوں

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص: ۲۶)

خدا کی رحیمی و کریمی کی مثال دیکھئے۔

پائیں گے نئی حیات مرنے والے
ہوں جائیں گے مطمئن یہ ڈرنے والے
امید ہے تو پھر بخش دے گا ہر جرم
او ماں سے زیادہ پیار کرنے والے

(امجد نمبر، ص:۱۶)

حضرت امجد کو خدا کی رحمت پر پورا اعتماد ہے۔ اسی لئے وہ ہر وقت خدا سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں:

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص: ۱۱)

رحمتِ خداوندی کے متعلق ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایا ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تری رحمت کے بھروسے امجدؔ
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۳۲)

توبہ ایک ایسا عمل ہے، جس سے نفس کی صفائی اور قلب کا تزکیہ ہوتا ہے۔ حضرت امجدؔ توبہ کی اہمیت اور افادیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

جب میں اپنی خطاؤں پہ شرماتا ہوں
اک خاص سرور قلب میں پاتا ہوں
توبہ کرتا ہوں جب گناہ سے امجدؔ
پہلے سے زیادہ پاک ہوجاتا ہوں

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۷۶)

یہ سب کا ایمان ہے کہ اللہ کی ذات ہی حیٌّ و قیوم ہے۔ وہی ذات باقی رہنے والی ہے۔ باقی سب کا فنا ہونا لازمی ہے۔ حضرت امجدؔ نے اس خیال کو کس خوبی سے باندھا ہے ملاحظہ کیجئے۔

واجب ہی کو ہے دوام باقی فانی
قیوم کو ہے قیام باقی فانی
کہنے کو تو زمیں و آسماں سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا نام باقی فانی

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص:۵)

امانتِ خداوندی کے سلسلے میں حضرت امجد نے کس عاشقانہ انداز میں یہ رباعی کہی ہے:

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تری بات رکھ لی میں نے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۶۱)

عشقِ رسول کا جذبہ بھی مذہبی تعلیمات کا اہم حصّہ ہے۔ بغیر عشقِ محمدؐ کے کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر بھی حضرت امجد نے موثر رباعیاں کہی ہیں۔ ان رباعیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اندر حُبِ مصطفوی کا جذبہ کس قدر پاک ولطیف تھا۔ ذیل کی رباعیاں ملاحظہ ہوں:

طیبہ ہی کو اب کعبۂ مقصد کہیے
دہلیز نبی کو سنگِ اسود کہیے
گر حمدِ خدا کا حق ادا کرنا ہے
دل سے اک بار یا محمدؐ کہیے

(رباعیات امجد حصہ دوم، ص: ۱۴)

سرپائے مبارک پہ جھکادوں آجا
آنکھیں تیرے قدموں میں بچھادوں آجا

تو میرے لئے آیا ہے اللہ غنی

میں آنسوؤں سے پاؤں دھلادوں آجا

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۵۶)

غرض حضرت امجد نے اپنی رباعیات میں اسلامی تعلیمات کو اس طرح سمویا ہے کہ وہ حکمتِ الٰہی کی توضیح معلوم ہوتی ہیں۔

اخلاقیات:

حضرت امجد کی شاعری، مذہبی و روحانی تعلیمات کے علاوہ اخلاق اور انسان دوستی کا درس بھی دیتی ہے۔ ان کے یہاں اخلاقیات کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ ان میں انسانی ہمدردی، لوگوں کے درمیان فلاح و بہبودی، صبر، رحم دلی، اخلاص، انسانیت کا احترام وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ دیگر تعلیمات کی طرح ان موضوعات کی ادائیگی میں بھی آپ کا حکیمانہ اور عارفانہ رنگ غالب ہے۔

صوفیائے کرام عوام کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت کرتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کو وہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا ان کو قبول کرنے پر خود بہ خود راضی ہو جاتا ہے۔ وہ مذہبی اور روحانی تعلیم کے ذریعہ سے انسان کے اندر بھی اعلیٰ اخلاق کی تشکیل کرتے ہیں۔

رباعیات امجد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اخلاقی رباعیات دل پر اثر کرتی ہیں۔ اور وہ انسان و معاشرہ کی بہتری کے سودمند ہیں۔ آپ اپنی رباعیات میں لوگوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ آپ کے لہجے میں نہ سختی ہوتی ہے اور نہ تلخی وہ ایک صوفیانہ نرمی و ملائمت سے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔

دنیا کا ہر مذہب یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کے کام آئے اور باہم محبت سے پیش آئے۔ اگر خدا کو خوش کرنا ہے تو اس کی مخلوق سے محبت کرو۔ اسی لئے حضرت امجدؔ کائنات کی تمام مخلوقات سے محبت کرنے کا درس دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تحمید یہ ہے
مخلوقِ خدا ہے، سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

(گلستانِ امجدؔ، ص:۶۵)

جو انسان دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش نہ آتا ہو، وہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہوتا۔ حضرت امجدؔ اس بات کو کس حکیمانہ انداز سے سمجھاتے ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

ہمراہ کرم حسنِ عمل تلتا ہے
احسان سے بابِ لطفِ حق کھلتا ہے
ہمدردی غیر میں ہے اپنا بھی بھلا
کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

(گلستانِ امجد، ص:۳۵)

حضرت امجدؔ کے نزدیک بھی تمام اہل دل، مفکروں کی طرح ، دل خدا کا گھر ہے۔ اور دل شکنی گناہِ عظیم لکھتے ہیں:

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزل فیض متصل کو توڑا

کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے

رونا تو یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص: ۴۴)

انسانیت کا احترام اسی وقت ہو سکتا ہے' جب سماج میں بھائی چارگی کا ماحول پیدا ہو۔ اور سب ایک دوسرے کے عقائد کی عزت کرتے ہوں' حتیٰ کہ دوسروں کی خامیوں کو بھی فراخ دلی سے معاف کر دیتے ہوں۔ حضرت امجد انسان دوستی کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر ہے منظور عزِّ کعبہ

کبھی نہ تحقیر دیر کیجئے

بروں کے حق میں حتی الامکان

دعائے توفیقِ خیر کیجئے

(پیامِ امجد، ص: ۳۴)

میاں امجد تمہاری جیسی مرضی

بنو کافر یا کہ اسلام لاؤ

مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات

جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص: ۹۸)

حضرت امجد نے اپنے کلام میں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے بڑا ہی دلکش و تمثیلی انداز اختیار کرتے ہوئے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے'

کہ وہ غرور، عجلت پسندی، بے صبری، ریا کاری وغیرہ جیسی بری خصلتوں سے باز آئیں اور ایک پاک اور بامعنی زندگی گزارنے کو کوشش کریں:

کم ظرف انسان جب کوئی چیز حاصل کر لیتا ہے تو وہ مغرور ہو جاتا ہے: جب اس کا غرور ٹوٹتا ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ کم ظرف انسان کی مذمت کرتے ہوئے حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

کم ظرف اگر مال و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص: ۴۴)

انسان عجلت پسند ہے۔ جبکہ فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صبر کی عادت ڈالے کیونکہ عجلت پسندی، اس کے اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ حضرت امجدؔ صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ سوم، ص: ۴۳)

ریا کاری و خودنمائی، انسانی فطرت کی وہ بری خصلتیں ہیں، جن سے آدمی اپنی

اصلیت کو بھول کر نقلی دنیا میں جینے لگتا ہے۔ حضرت امجؔد ایسی ریا کاری اور ایسے ریا کاروں کی بری طرح مذمت کرتے ہیں۔ جو لوگ دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔ ان پر اپنا غصہ یوں اتارتے ہیں:

پر داخت نہ کی تو نے کماہی دل کی
دیکھی نہ کبھی حیف تباہی دل کی
اے زاہدِ خود بیں یہ نہیں داغِ سجود
پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

(پیامِ امجؔد، ص:۱۵۹)

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت ! تم سے تو دیا سلائی اچھی

(رباعیاتِ امجؔد، حصہ اول، ص: ۲۰)

حریص و لالچی انسان کے متعلق لکھتے ہیں:

افیوں ہو یا مٹھائی منہ میں رکھ لی
چیز اپنی ہو یا پرائی منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی
جو چیز ملی اٹھالی' منہ میں رکھ لی

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص:۲۱)

حریص انسان اپنی مادہ پرستی کی وجہ سے داخلی اور روحانی زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے۔ مادیت کے نشہ میں وہ آخرت کی زندگی کو تباہ برباد کر لیتا ہے۔ حضرت امجدؔ ایسے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کچھ عجب ہے یہ مادی دنیا
دور تک اس کا دور جاتا ہے
شمع پروانے کو جلاتی ہے
شمع کو بھی کوئی جلاتا ہے

(پیامِ امجدؔ،ص:٦٧)

غریبوں کے حالاتِ بدتر پر حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں
مردود درِ جیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

(پیامِ امجدؔ،ص:١٠٩)

ایک اور جگہ آپ غریبوں اور مفلسوں کو تسلی دیتے ہیں۔ وہ سمجھاتے ہیں کہ ان کی غریبی لعنت نہیں، نعمت ہے۔ کیوں کہ امیروں کو ہر وقت اپنی دولت کے لٹ جانے کا غم ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی زندگیوں سے سکون چھن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

جہاں حضرت امجدؔ غریبوں کی زندگی سے غمگین ہیں، وہیں انہیں امیروں کی دولت کو دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے 'اور وہ متحیر ہیں کہ امیروں کے پاس جینے کے لئے سارا سامان ہونے کے باوجود وہ مرتے کیوں ہیں۔ فرماتے ہیں:

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں

سر چڑھ کے زمیں میں اترتے کیوں ہیں

رکھ کر بھی تمام زندگی کا سامان

معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

(پیامِ امجدؔ، ص:۱۱۰)

امیروں کے گھروں میں دنیا بھر کا سامان ہونے کے باوجود انہیں سکون کی نیند میّسر نہیں ہے۔ انہیں اپنی مادّی دنیا سے اتنی بھی فرصت نہیں ہے کہ وہ آخرت کی فکر کریں۔ حضرت امجدؔ کہتے ہیں کہ مادّی زندگی سے روحانی سکون واطمیان حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کو چاہئے کہ وہ آخرت کی فکر کرے۔

زندگی کی بے یقینی کو سمجھاتے ہوئے کس قدر عاجزانہ انداز سے لکھتے ہیں دیکھئے:

اچھا نہیں ہے یہ غرور جلدی کیجئے

حتی الامکان ضرور جلدی کیجئے

ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے

چلنے کے لئے حضور جلدی کیجئے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص:۵۰)

حضرت امجدؔ رحم دلی اور سخاوت کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے امیروں سے

مخاطب ہوتے ہیں کہ وہ غریبوں کی مدد کریں ۔ تا کہ انہیں روحانی سکون میّسر ہو ۔ فرماتے ہیں:

بیچاروں پہ رحم فضلِ رحمانی ہے
بندوں پہ کرم عین خدا دانی ہے
اطعام مساکین سے غذائے روحی
اپنا کمانا غذائے جسمانی ہے

تمام جھگڑوں اور فسادات کی جڑ انسان کا غصّہ ہوتا ہے ۔ جس نے اس پہ قابو پالیا وہ کامیاب ہوگیا ۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خود کو خاموش رکھے ۔ خاموشی کی اس اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

ہر چند مصیبتیں زمانہ کی ہے
انسان کو چاہئے کہ خاموش رہے
ہوتی ہے اسی لئے بتوں کی پوجا
کہتے نہیں کچھ، کوئی لاکھ کہے

(گلستانِ امجدؔ، ص:۹۵)

حضرت امجدؔ کی بیشتر اخلاقی رباعیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو نصیحت کر رہے ہیں ۔ دوسروں کی انا کو وہ ہرگز ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے ۔ وہ خود کو جاہل کہتے ہوئے انسانوں کی جہالت کو پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہوجا

گالی، غیبت، دروغ گوئی کب تک
امجدؔ کیوں بولتا ہے گو نگا ہو جا

(پیامِ امجدؔ، ص:۸۲)

غرض حضرت امجدؔ کے یہاں تصورِ انسان کے لئے جو اوصاف ضروری ہیں، وہ رحم دلی، انسان دوستی، اخلاص، صبر، عاجزی وانکساری وغیرہ ہیں۔ یہ وہ اوصاف ہیں، جو انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتے ہیں اور انسانیت کا احترام کرنا سکھاتے ہیں۔

اختتامیہ:

حضرت امجدؔ کا شمار اردو کے ممتاز صوفی شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بذاتِ خود ایک صوفی باعمل تھے۔ اور تصوف کا گہرا علم رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں، خواہ وہ نثر ہو یا نظم، تصوف ومعرفت کا عنصر غالب ہے۔ ان تحریروں سے آپ کے روحانیت کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے کلام میں معرفتِ الٰہی کے مختلف منازل کو پیش کیا ہے، علم تصوف کے مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، مذہبی تعلیمات کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور انسانی واخلاقی اقدار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

حضرت امجدؔ نے معرفتِ الٰہی کے ضمن میں، خدا کے وجود، اس کی بزرگی وکبریائی اور قربِ الٰہی جیسے پاکیزہ جذبات وخیالات کو نہایت ہی لطیف اور حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

تصوف کے مسائل کا ذکر بھی حضرت امجدؔ کے کلام کا خاص موضوع رہا ہے۔ انہوں نے تصوف کے دیگر مسائل جیسے مسئلہ وحدت الوجود، مسئلہ وحدت الشہود، ہمہ اوست ہمہ از اوست، جبر واختیار، تقدیر وتدبیر وغیرہ مسئلوں کی وضاحت اپنے کلام میں دلچسپ اور عام فہم انداز میں کی ہے۔

مذہبی تعلیمات کے تحت حضرت امجدؔ نے تصوف و معرفت کے پیرائے میں مذہب کے تقدس اور اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ خدا پر ایمان، فرائض کا اہتمام، شریعت کی پابندی، خدا کے مختلف صفات کا ذکر، عبادیات، عشقِ الٰہی، عشق رسول وغیرہ موضوعات کو حضرت امجدؔ نے اپنے مذہبی تعلیمات کا سرمایہ بنایا ہے۔ ان رباعیات کی خاص بات یہ ہے کہ یہ قرآن وحدیث کی حکیمانہ تشریح معلوم ہوتی ہیں:

حضرت امجدؔ نے اپنے کلام میں اخلاقیات کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ انسان کی تربیت کے لئے انہوں نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتے ہوئے اعلٰی انسانی اقدار کو برقرار رکھنے کی ترغیب دی ہے۔ اور لوگوں میں باہمی محبت، صبر، رحم دلی، اخلاص، انسان دوستی، عاجزی وانکساری وغیرہ مختلف اخلاقی پہلوؤں کا درس دیا ہے۔

باب چهارم

ویمنا اور ویدانت

ا۔ ویمؔا کا دین و مذہب:

ویمؔا کے فسلفہ یا ویدانت کو سمجھنے سے پہلے اس کے مذہب اور عقاید کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کسی نہ کسی مذہب پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی سوچ پر مذہبی عقاید کا اثر ضرور پڑتا ہے۔

عہدِ ویمؔا میں ہندو مذہب کی کئی شاخیں ہوگئی تھیں۔ اور وہ مختلف فرقوں اور ذاتوں میں ~~ذاتوں میں~~ بٹ چکا تھا۔ ویمؔا نے شاعری میں جن مذاہب کے تعلق سے اپنے خیالات اور افکار کا اظہار کیا ہے' ان میں مسلک ادویتا اور شیومت کو اہمیت حاصل ہے۔

ادویتا پر یقین رکھنے والے برہما کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ان کا ایمان تھا کہ برہما خود انسان میں موجود ہے۔ اس خیال کی تائید کرتے ہوئے ویمؔا لکھتا ہے:

برہما کہیں اور نہیں
تجھ میں موجود ہے
جس نے خود کو پہچان لیا
اس نے خدا کو جان لیا

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص: ۳۲۸)

برہما کا کوئی روپ نہیں، وہ صرف ایک احساس ہے۔ ادویتا کے اس نکتہ کو ویمؔا یوں بیان کرتا ہے۔

برہما کا کوئی روپ نہیں
وہ ایک تجربہ ہے۔ ایک احساس ہے
برہما کا علم رکھنے والے برہمن
اس نکتہ سے ناواقف ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۴۱۴)

برہما کو کس طرح پایا جا سکتا ہے اور اسکے لئے کیا کرنا چاہیے۔ اس تعلق سے ویما لکھتا ہے۔

مسلسل برہما کی فکر سے
اور پورے دھیان سے
برہما کا احساس ہوتا ہے
اس کو پایا جا سکتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۶۲)

یہ اور اس طرح کے کئی پدوں سے محسوس ہوتا ہے کہ ویما ادویتا مسلک پر ضرور ایمان رکھتا تھا۔تا ہم اس کے بعض ایسے پد بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ادویتا کے بعض اصولوں کا مخالف بھی تھا۔

ادویتا مسلک ویدوں کے خلاف نہیں تھا۔ اس کے اصول ویدوں کی بنیاد پر بنائے گئے تھے۔مگر ویما پدوں کے بعض اصولوں کو فاحشانہ قرار دیتا ہے۔

ویدوں کا علم
فاحشہ عورت کی چال ہے
جو کسی کو سمجھ میں نہیں آتی
وید کا علم رکھنے والا بے وخوف ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۵۸۱)

ادویتا میں عبادت کے سخت سے سخت طریقے پائے جاتے تھے۔جن سے جسم کو کافی تکلیف ہوتی تھی۔ویما نے ان طریقوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔

ناک میں کپڑا ڈالتے ہیں

آسن جماتے ہیں' بار بار نہاتے ہیں

جسم کو تکلیف دیتے ہیں

کیا ان سب سے نجات مل جائے گی؟

(ویمنا پدیارتنا کر مولو، ص:۲۱)

مسلکِ ادویتا میں برہمنوں کی ذات کو سب سے اعلیٰ قرار دیا گیا ہے۔ ویمنا نے اس نکتہ کی کھل کر مخالف کی ہے۔ وہ برہمنوں کو کتوں سے بدتر قرار دیتا ہے۔ لکھتا ہے۔

برہما ہر ایک میں موجود ہے

برہمنوں کو تحفے دینے کی کیا ضرورت

اس سے اچھا ہے کہ تم

کتوں کو کچھ کھلا ڈالو

(ویمنا پدیارتنا کر مولو، ص۱۶۲۱)

مسلکِ ادویتا کے علاوہ ویمنا شیومت سے بھی کافی متاثر تھا۔ اس مسلک کے اصول سماج کی بے اعتدالیوں کو دور کرنے کے مقصد سے بنائے گئے تھے۔ شیومت اونچ نیچ' ذات پات کے فرق کو نہیں مانتا تھا۔ اس خیال کی تائید کرتے ہوئے ویمنا لکھتا ہے۔

کوئی ذات کسی ذات پر حاوی نہیں

سب شیخیاں بے معنی ہیں

سب انسان برابر ہیں

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون برتر ہے

(ویمنا پدیارتنا کر مولو، ص:۲۵۱)

اس دور کے شیو بھکت شیو کے لنگ کو گلے میں لٹکایا کرتے، یا سر پر باندھا کرتے، یا پھر ہاتھ میں باندھے رہتے تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر شیو کی عبادت کے متعلق ویمنا کہتا ہے:

تم شیو کے لنگ کو باندھے رکھتے ہو

کیا کوئی انہیں چرا لے گا؟

دل کے مندر میں شیو کو بٹھاؤ

پوری یکسوئی سے اس کی پوجا کرو

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۱۴۸)

ویمنا نے شیومت کی تائید میں کئی پد لکھے ہیں۔ ساتھ ساتھ اس نے شیومت کے اصولوں کے خلاف بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شیو بھکت شیو کی عبادت کرتے اور ملک کے مقدس شیو مندروں کے درشن کرتے پھرتے۔ ویمنا ان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

کیوں مصیبت اٹھاتے ہو

چکر کاسی کے لگاتے ہو

خود کو برباد تو نہ کرو

دل کو جانو شیو کو پہچانو

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۱۶۴)

شیومت میں عورتوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مگر ویمنا کی نظر میں عورت سارے فساد کی جڑ اور برائی کا سرچشمہ ہے۔ لکھتا ہے۔

عورت آگ اور مرد موم کی مانند ہے

جب مرد عورت کے قریب ہو جاتا ہے

وہ پگھل کر برباد ہو جاتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۲۳۴)

خواہ ویمنا کسی مذہب پر کامل عقیدہ نہ رکھتا ہو مگر وہ ایک سچا متلاشی حق تھا۔ اور توحید پر اس کا ایمانِ کامل تھا۔ وہ ایک موحد تھا جس نے ایک خدا کی پرستش کی تھی اور وہی اس کا مذہب تھا۔ عہدِ ویمنا میں ادویتا کے پیروکار برہما کو خدا مانتے تھے، جبکہ واشنوی، وشنو بھگوان کی پرستش کیا کرتے تھے اور ویرشیوی، شیو کی پوجا میں محو تھے۔ ان تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ویمنا توحید کی تعریف یوں کرتا ہے۔

برہما کو فنا کردو وشنو میں ملا دو

وشنو کو فنا کردو شیو میں ملا دو

شیو کو فنا کردو خود میں ملا دو

یہی ایک سچے یوگی کی پہچان ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۱۱)

ویمنا نے توحید کے راستے پر چل کر انسانی تہذیب کی تربیت کی تھی۔ لوگوں کی زندگی کی تشکیل کی تھی۔ اور خدا کے تصور کو عام کیا تھا۔ یہ وہی بنیادی نکات ہیں جن سے ویمنا کے فلسفہ کی تعمیر ہوتی ہے۔

گوپی نے ویمنا کو انسانیت کا پیام بر قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"అనేక మతాల చిత్రవర్ణాలతో ఏర్పడిన ఇంద్ర ధనస్సు వేమన మతం. మానవుడు మానవుడుగా మనలేక పోతున్నాడే అనే ఆవేదన వేమన తాత్త్విక చింతనకు దారి తీసింది .... మతాల పుటలు విప్పి చూచిన వేమనకు వాటి తాత్త్వికాంశాలతో వివాదం ఉన్నట్టు కనబడదు. కానీ వేమన్నకు తీవ్ర్యమైన నిరాశకు గురిచేసింది, ఆగ్రహాన్ని రగల్కొల్సిందీ, ఆనాటి మతాల దంభ జీవితమే........ "రెండు నాలుకలు, రెండు జీవితాలు" ఇదీ ఆనాటి మత వ్యవస్థ .... ఇక ఆ మానవుని రక్షించడమే తన తక్షణ కర్తవ్యంగా నిర్ణయించుకున్నాడు వేమన. ఆ క్షణం నుండి ఆ దుస్థితికి కారణాల అన్వేషణలో పడి పోయాడు" (ప్రజాకవి వేమన. పేజి - 168)"

ترجمہ:

''بیشتر مذہبوں کا مرکب' ویما کا مذہب ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ انسانی تہذیب نے اپنے اقدار کھو چکے ہیں اور ان کی سدھار ضروری ہے۔۔۔۔ ویما نے دیگر مذاہب میں انسان کی تعمیر و تشکیل کے راستے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی ۔ مگر مذہب فرقہ واریت میں بٹ چکا تھا۔۔۔۔ '' دو زبانیں، دو زندگیاں'' اس دور کا مذہبی نظام تھا ۔۔۔۔۔ ویما نے اپنی زندگی کا مقصدِ عین انسانی تہذیب کی تعمیر و تشکیل سمجھا ۔ اور وہ انسان کی بدحالی کے اسباب ڈھونڈ نکالنے کی کوشش میں لگ گیا۔

(پرجاکوی ویمنا، ص:۱۶۸)

ویما کے فلسفہ کو انسانیت کا نام دیتے ہوئے نارلا لکھتا ہے۔

" vemana places man so much in the centreof things, his philosophy is basically humanistic .....He has a philosophy ofhis own and it covers every man and every aspect of a man`s life "

(Vemana -page-63)

ترجمہ:

''ویما نے اپنی شاعری میں انسان کو مرکزی اہمیت دی ہے۔
بنیادی طور پر اس کا فلسفہ انسانیت پر مبنی ہے۔۔۔۔۔ ویمنا کا
خود ایک فلسفہ ہے جو انسان اور اس کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی
ڈالتا ہے۔''

(ویمنا، ص:۶۳)

غرض ویمنا نے انسانیت کے احترام کا درس دیا ہے۔

۲۔ ویمنا اور ویدانت:

درحقیقت مذہب ہو یا فلسفہ یا ویدانت انسانی تہذیب کی تعمیر و تشکیل کے لئے ہی وجود میں آتے ہیں۔ انسانی تہذیب کو بہتر بنانے میں ویمنا نے اپنی شاعری کے ذریعہ جو سعی کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سچا متلاشی حق تھا۔ لہذا ویمنا کے ویدانت پر غور کرنا از بس ضروری ہو جاتا ہے۔

ویمنا واقعی بہت بڑا انسان تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کی زندگی اور تہذیب کو سدھارے۔ اس کا تمام فلسفۂ حیات، خدا پرستی کا نتیجہ تھا۔ ویمنا نے خدا پرستی میں ہی فلاحِ انسانیت دیکھی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ انسان اپنے آپ سے اس وقت تک بے خبر ہوتا ہے جب تک کہ وہ خدا کو نہیں جانتا ہے۔ ویمنا کا فلسفہ حیات ایک مردہ خیال ہے اور نہ ہی کوئی ناقابل عمل نظریہ۔ بلکہ وہ ایک فطری اور عملی نظریہ حیات تھا۔ حقیقت میں وہ انسان کو اس کے انسانی جوہر سے آگاہ کرانا چاہتا تھا' کیوں کہ انسانیت بغیر خدا پرستی کے اور خدا پرستی بغیر انسانیت کے ممکن نہیں ہے۔ انسان، انسان بن کر ہی خدا ترس بن سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

ویمؔا انسانوں کی فطرت سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے خیالات آج بھی ویسے ہی زندہ و تابندہ ہیں جیسے کہ اس زمانے میں تھے۔ اسی وجہ سے ویمؔا کے پیام کی پکار آج بھی ویسی ہی سنی جا سکتی ہے جیسے کہ اس زمانہ میں سنی گئی تھی۔ ویمؔا کا پیام وقتی نہ تھا۔ وہ ایک فطری پیام ہونے کی بنا پر اسے ابدیت حاصل ہے۔

۲.۱: انسانی تہذیب:

ویمؔا نے انسانیت کے پیام کو اپنی شاعری کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے اپنے ملک کے مختلف طبقوں کے تہذیبی اور تمدنی حالات سے بخوبی واقفیت حاصل تھی۔ وہ اعلیٰ اور ادنیٰ لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی جانتا تھا۔ اور وہ یہ محسوس کر چکا تھا کہ انسان ابھی اصلی تہذیب اور تربیت سے بہت دور ہے۔ ویمؔا کی تمنّا یہ تھی کہ انسان اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جائے۔ تا کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کر کے اپنی زندگی کی منزل خود طئے کرے۔

ویمؔا کا یقین تھا کہ اکثر لوگ خود سے نا واقف ہیں اور اپنے کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ انسان کو اپنی حدیں معلوم کر لینی چاہیے۔ ویمؔا نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے۔

انسانوں کو نہ اپنی پیدائش معلوم ہے
نہ موت، نہ آغاز، نہ انجام
کیا یہ مضحکہ خیز نہیں ہے کہ
وہ خود کو مالکِ دو جہاں سمجھے

(ویمنا پدیا رتنا کرمولو، ص: ۲۹۲)

ویماؔ کا یہ خیال خام نہیں بلکہ انسانی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ زندگی انسان کو یہ منوانے پر مجبور کرتی ہے کہ انسان دنیا کا مالک نہیں بلکہ وہ کسی طاقت کا محتاج ہے۔ اس کو اس امر پر غور کرنا چاہیے۔ اس کا رشتہ دنیا سے کن اصولوں کے تحت جڑ سکتا ہے۔ اور اس کا مرتبہ دنیا میں کس نوعیت کا ہے۔ پیدائش اور موت انسان کے آغاز اور انجام کی منزلیں ہیں جن سے وہ گزرتا ہے۔ لیکن ان پر اُس کو قابو نہیں ہے۔ اپنی اصلیت سے غافل ہو کر انسان دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن وہ اس امر سے بے خبر ہے کہ اس کی زندگی اصولوں پر قائم نہیں ہے۔ ویماؔ انسان کو یہ سمجھاتا ہے کہ زندگی بے کار شئی نہیں بلکہ کار آمد چیز ہے۔ زندگی کے موہ و مایا میں گُم ہو کر اپنی اصلیت سے بے خبر ہو جانا احمقانہ فعل ہے۔ کیوں کہ دنیا کو آخر چھوڑ جانا ہے۔ وہ وقت کے تابع ہے۔ زندگی کے اس روپ سے انسان خبردار ہو کر دنیا کے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کرے تاکہ اسے دنیا میں رہتے ہوئے سکون حاصل ہو۔

ویماؔ نے انسانی تہذیب پر زور دیتے ہوئے اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ انسان کی قسمت کا فیصلہ اس کے اعمال میں پوشیدہ ہے۔ انسانی ترقی اعمال کی تربیت میں چھپی ہے اور اعمال کی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اپنے آپ سے آشنا نہ ہو۔ انسانی تہذیب انسان کے مرتبے کا تعین کرتی ہے۔ ویماؔ کا خیال ہے۔

سب سے افضل وہ ہے جو جانے حق کو

جو ہے اوسط درجے کا وہ شیخی بگھارے

سب سے بدتر انسان ہے وہ جو پیٹ کی خاطر

پہنے ہے دینی لباس

(ویمنا پدیا رتنا کرمولو، ص:۳۷۶)

ایک اور پد میں کہتا ہے۔

جو کہے، میں کچھ نہیں جانتا، وہ ہے سمجھدار

جو کہے میں سیکھ رہا ہوں وہ کرے بکواس

جو پرسکون ہے ، وہ دانشور ہے بہتر ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمولو،ص:۱۵۵)

ویمنا نے بیداریٔ خودی میں تہذیبِ انسانی کے اعلیٰ معیار کو دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے اس کا قول ہے۔

اپنے کو جان لینا بڑی بات ہے

اگر ہم خود کو نہ جان سکیں تو

کوئی دوسرا ہمیں گیان نہیں دے سکتا

(ویمنا پدیارتنا کرمولو،ص:۴۱۳)

خودی کی بیداری انسان کو اعلیٰ اقدار سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان اعلیٰ معیار پر پہنچنے کے لئے خود انسان کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسے کسی غیر انسانی قوت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود زندہ ہستی ہے جس میں انسانی قوتیں پنہاں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے انسانی جوہر سے آگاہ ہو جائے۔ ویمنا اعلیٰ انسان کے متعلق اپنے خیالات کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

تمام انسانوں میں اعلیٰ انسان وہ ہے

جو سکونِ قلب حاصل کر چکا ہو

جو اپنے مذہب کا پابند ہو

دوسرے مذہبوں کو برا نہیں کہتا ہو

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۸۵)

ویمؔا نے اس پد میں فلسفہء انسانیت کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

مذہب دراصل اس راستہ کا نام ہے جس پر چل کر انسان خدا کو پہچان لیتا ہے اور خدمتِ خلق کو اپنا وطیرہ بنالیتا ہے۔ ویمؔا کا یہی کہنا تھا کہ اگر انسان اپنے مذہب کا پابند ہو تو وہ کسی بھی حالت میں دوسرے مذاہب کو بُرا نہیں کہتا اور ان سے نفرت نہیں کرتا۔

ویمؔا کا 'انسان' انسانی تہذیب کا حامل ہے۔ اگر اس میں یہ اوصاف موجود ہوں کہ اپنے دل پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے تو وہ بلا شبہ بہترین انسان ہے۔ ویمؔا نے اپنے اس خیال کی تشریح یوں کی ہے:

جس نے آج یا کل یا پرسوں تک
یہ سیکھ لیا ہو کہ
دل پر قابو کیسے پایا جاتا ہے
وہ انسانوں میں سب سے بہتر ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۳۴۵)

انسانِ کامل ویمؔا کے نقطۂ نظر سے وہ انسان ہے جس نے حق کی آگہی حاصل کر لی ہو۔ جس نے دنیا اور انسان کے رشتہ کو معلوم کر لیا ہو ۔ اور اپنی زندگی کے حدود قائم کر لیے ہوں۔ بایں وجہ ویمؔا کا یہ پد انسانِ کامل پر صادق آتا ہے۔

جو جان چکا ہو کہ تمام انسانوں کا خاتمہ لازمی ہے
اور موت یقینی ہے، یہ جانتے ہوئے اس نے اگر
خدا کے اوصاف پر دھیان دیا
تو وہ ایک کامل انسان ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۵۱۲)

ویما کا انسانِ کامل دراصل انسانی بزرگی کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے۔

انسانوں میں صرف وہی بزرگی کے مرتبے کا مستحق ہے

جو یہ جانتا ہو کہ اس کا دل خدا کا گھر ہے

خود کو اگر تو جان لے تو خدا اسے مل سکے گا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۵۵۵)

ویما کی تمنا یہ تھی کہ انسان سماجی حقائق سے آگاہ ہو کر انسانی زندگی کی قدروں کو سمجھے اور ان کی تشکیل کرے۔ اس کا یقین تھا کہ وہ سماج جس کے قوانین ذات کی بنا پر بنائے گئے ہوں، بیکار ہے۔ کیوں کہ ذات کا امتیازی قانون انسانوں میں فرق پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں انسانوں کے مراتب کے تعین کی قوت نہیں ہے۔ ویما لکھتا ہے۔

غور کرو کہ کیا، ایک ذات دوسری سے بہتر ہے

فہم وذکا کے بغیر زندگی بے معنی ہے

سمجھ دار آدمی پیدا ہو سکتا ہے

کسی بھی ذات کسی بھی قبیلہ میں

(ویمنا پدیا رتنا کرمولو، ص: ۳۳۲)

ویما ذات کے متعلق اس خیال کی بھی وضاحت کر دیتا ہے کہ انسان اعلیٰ ہستی ہے۔ انسان کو ذات کی وجہ سے کم تر سمجھنا بے وقوفی ہے۔ ویما لکھتا ہے۔

زمین، ذات، اور غذا سے

ہمارے جسموں پر کوئی اثر نہیں پڑتا

لوگوں کو ذات کی وجہ سے تکلیف دینا

ایک بیہودہ اور کمینی حرکت ہے

(ویمنا پد یار تنا کرمولو،ص: ۲۰۴)

ویماؔ کی یہ کوشش رہی ہے کہ ذات اور قبیلے کے جنون کو ترک کرنا انسان کی فلاح کے لئے ضروری ہے۔ اس کا یقین تھا کہ

اگر ہم کائنات کا مشاہدہ بغور کریں
تو ہم دیکھیں گے کہ تمام ذاتیں ایک ہیں
اسی وجہ سے تم سب ایک ہو
آپس میں بھائی بھائی ہو

(ویمنا پد یار تنا کرمو،ص: ۳۳۹)

ویماؔ نے یہ بتا دیا کہ انسان اپنی زندگی میں مساوات کے اصول پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ یہی یقین اور عمل ویماؔ کا تھا۔ انسانی برادری کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کے انسان میں اپنی انا کا گھمنڈ موجود ہو۔ ویماؔ جانتا تھا کہ اس گھمنڈ کو کیسے توڑا جا سکتا ہے۔ انسانوں کی برادری کا تخیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر نہ رہیں اور مل جل کر نہ کھائیں پیئیں۔ اس خیال کو یوں بیان کرتا ہے۔

سب کو کھانا پروسو ساری دنیا کے لوگوں کو
ایک تھالی میں سب مل بیٹھ کر کھائیں گے
بھول جائیں گے سارے امتیازات
سب جئیں گے ایک ہو کر

(ویمنا پد یار تنا کرمو،ص: ۷۷)

ویماؔ نے انسانی کردار کی تہذیب پر بہت زور دیا ہے۔ اس کا یقین تھا کہ انسانی تہذیب اس کے اعمال میں زندہ ہوتی ہے یا مر جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اچھوت کا اور دوسرے انسانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ویماؔ نے اپنے خیال کو یوں پیش کیا ہے:

دنیا میں اس سے زیادہ بد بخت کوئی نہیں ہے
جو دوسروں کو بُرا بھلا کہے
اور اچھوت سمجھے
مرنے کے بعد اس کو جہنم نصیب ہوگی

(ویمنا پدیا رتنا کرمولو، ص:۴۲)

ویمنا کے مساوات کی نقطہء نظر کے تعلق سے 'نارلا' لکھتا ہے۔

" As a social philosopher , vemana is an advocate of human equality . He believes fervently that there can he no equality so long as the caste system , with its many grandations and degrandations, its totem an taboos is not done away with "

(vemana-page-56)

ترجمہ:

''بحیثیتِ سماجی مفکر کے ویمنا نے انسانی مساوات کی حمایت کی ہے۔ اسے کامل یقین تھا کہ مساوات اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتے جب تک کہ سماج سے اونچ نیچ، ذات پات کے فرق کو مٹا نہ دیا جائے۔'' (ویمنا ص:۶۳)

ویمنا صاف صاف لفظوں میں کہا ہے کہ آدمی پیدا ہوتا ہے، مگر انسان بنانے سے بنتا ہے۔ انسانوں میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ وہ ان کی تہذیب وتربیت کی وجہ سے ہے نہ کہ ذات پات اور اونچ نیچ کے باعث۔

۲.۲: زندگی کی تشکیل:

انسان کے اخلاق کی تہذیب ہو نہیں سکتی جب تک وہ خود اپنی زندگی پر غور وفکر نہ کرے۔انسان اپنی سماجی زندگی سے الگ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق اس کے خیالات ونظریات ہی اسے بنانے یا بگاڑنے میں مدد دیتے ہیں۔اسی وجہ سے ویماؔنے انسانی تہذیب پر غور وخوص کرتے ہوئے انسان کواس بات سے آگاہ کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا احتساب کرے۔انسان کے لئے زندگی ایک خوب صورت نعمت ہے۔اور زندگی کو بہتر اور بامعنی بنانا سب سے بڑا فن ہے۔ویماؔ لکھتا ہے:

جوگھاس کھاتے ہیں انھیں پھلوں کی مٹھاس کیا معلوم؟
جو معمولی فنوں سے ہیں واقف
انہیں زندگی کے فنِ اعلیٰ سے کیا نسبت؟
بے شک زندگی گزارنا سب سے بڑا فن ہے!

(ویمنا پد یارتنا کرمولو،ص: ۲۷۱)

زندگی کے حقائق کی جستجو کرتے ہوئے ویماؔنے انسانوں کوان کی بے خبری سے آگاہ کیا ہے۔اس نے یہ بتایا ہے کہ انسان کا وجود محض جسمانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے اندر ایک قوی روحانی قوت بھی رکھتے ہیں۔انسان کا صرف یہ سمجھ لینا کہ اس کے اندر ایک روح ہے کافی نہیں ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ روح اور جسم کے باہمی تعلق کی نوعیت کو سمجھے۔اور اس رشتہ کو استوار کرے۔اس یقین کی بنیاد پر انسان کی زندگی میں تبدیلی آسکتی ہے۔جسمانی زندگی بے معنی ہے اگر انسان اپنی روحانی زندگی سے بے خبر ہو جاتا ہے۔اسی وجہ سے ویماؔنے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے:

جسم کو ہم پانی سے پاک کرتے ہیں

اس کو غذا دیکر پالتے اور سنوار تے ہیں
اس کی خاطر ہم کتنی تکلیفیں اٹھاتے ہیں
جب کہ یہ جسم ایک دن فنا ہو جائے گا

(ویمنا پدیارتنا کرمولو،ص:۳۲۲)

جسم کے اس انجام کو لوگ جانتے ہیں' اس کے باوجود ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔ وہ جسے زندگی کی اصل مانتے ہیں، ویمؔا زندگی کا دھوکا کہتا ہے:

بیوی اور بچے محض دھوکا ہیں
خوشی اور غم سمجھ کا پھیر ہے
انسان نے دھوکے کی زندگی کو
کھوکھلے خیالات سے بھر رکھا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمولو،ص:۲۱۸)

مادّی چیزوں کو انسان زندگی کی نعمتیں سمجھتا ہے ۔لیکن ویمؔا کے نقطۂ نظر سے ان میں کوئی اصلیت نہیں ہے ۔ وہ کہتا ہے:

جس طرح پانی پر لکھا ہوا رہتا نہیں
اسی طرح زندگی کی تمام نعمتیں
غائب ہو جاتی ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمولو،ص:۵۱)

انسان کی عام ذہنیت ہے کہ وہ اپنے متعلق یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا ہے اور کیا سے کیا بن سکتا ہے ۔اس کی سوچ زیادہ تر دنیوی معاملات کی حد تک رہتی ہے، اصل زندگی سے وہ لاپرواہو جاتا ہے۔

ہم اپنے آنے جانے پر غور نہیں کرتے

ہم زندگی کو امر سمجھتے ہیں،

اور بے سوچے بسر کرتے ہیں

اس طرح پروانہ کی مانند آگ میں کود پڑتے ہیں

(ویمنا پدیارتا کرسو،ص:۲۲۸)

ویما اس نظریہ کا مخالف تھا۔ جو زندگی کے تانے بانے کو توڑ کر اس کو منتشر کر دے۔ زندگی کا نظام بیکار نہیں ہے۔ بلکہ کار آمد ہے۔ ویما کا مقصد یہی تھا کہ وہ انسانوں کو نئی راہ دکھائے اور ان میں نئے احساسات پیدا کرے تا کہ انسان کی انفرادی اور سماجی شتیوں میں اضافہ ہو سکے۔ دنیا سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنا انسان میں غیر انسانی خصائل کو فروغ دیتا ہے۔ ویما نے کبھی نہیں چاہا کہ انسان میں غیر انسانی خصوصیتیں پیدا ہو جائیں۔ انسان کو انسان بنانا اور انسان کو انسانی حیثیت دینا ہی ویما کی تعلیم کا مرکزی خیال ہے۔

انسان دنیا میں چند دن رہتا ہے۔ جو اس کے لئے ایک آزمائش کی جگہ ہے۔ اس کے بننے اور بگڑنے میں اُس کی کامیابی اور ناکامی کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ ویما کا عقیدہ یہ نہ تھا کہ دنیا انسان کی روحانی زندگی میں حائل ہوتی ہے۔ بلکہ اس کا ماننا تھا کہ انسان کو اس دنیا میں رہتے ہوئے روحانیت کے لئے جدوجہد کرنا چاہیے۔ ویما کہتا ہے۔

ان کا عقیدہ جھوٹا ہے جو اپنی

زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں

کیا تم نہیں دیکھتے کہ

روح کا آغاز زندگی سے ہوا ہے؟

(ویمنا پدیارتا کرمولو،ص:۸۸)

اسی خیال اور احساس کے تابع انسان دنیا میں رہتا ہوا اپنے آپ دنیا کو سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کا ترک کرنا غیر انسانی فعل ہے۔ ویمؔا کا خیال ہے کہ ترکِ دنیا سے انسانی تہذیب کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس خام خیالی نے انسان کی زندگی کو کھوکھلے نظریات سے بھر دیا ہے۔ ایسے لوگ فقیر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان کا دل فقیری کے جذبہ سے خالی ہے۔ ان میں انسانیت کی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ویمؔا فقیرانہ ذہنت کا مخالف تھا۔ کہتا ہے۔

وہ شہر اور زمیں سے رخصت ہوتے ہیں
ان کے دل محبت سے خالی ہیں
آخر کیوں اپنے بیوی بچوں کو
مصیبت میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں

(ویمنا پدیا رتنا کر مولو، ص:۳۹۰)

ویمؔا تشکیلِ حیات میں خواہشات کو کوئی جگہ نہیں دی ہے۔ کیوں کہ خواہشات انسان کو زندگی کے اصل مقصد سے دور کر کے اسے برباد کر دیتی ہیں۔ ویمؔا کہتا ہے۔

جس طرح مچھلی شکار کی چاہ میں
کانٹے میں پھنس کر مر جاتی ہے
خواہشوں کے پھندے میں پھنس کر
انسان تباہ و برباد ہو جاتا ہے

(ویمنا پدیا رتنا کر مولو، ص:۱۳۲)

انسان اپنے حدود سے بے خبر ہو کر اپنی خواہشوں کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ وہ اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھے۔ ورنہ وہ دوسروں اور خود اپنی نظروں میں گرِ جاتا ہے۔ ویمؔا کا ایقان تھا:

جوانسان اپنی خواہشوں کا شکار ہو چکا ہو

وہ سب سے نیچ ہے

برتر انسان ہے وہ جس نے

اپنی خواہشات پر قابو پالیا ہو

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۱۴۲)

انسان کی روحانی زندگی کی تشکیل میں خواہشوں کی تہذیب بے حد ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ویمنا کہتا ہے۔

جب تک تو خواہشوں کی رسّی کو

کاٹ کر پھینک نہیں دیتا

تجھ کو بہشت نہیں ملے گی

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۳۱۳)

ویمنا انسانوں کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قوی سے قوی تر خواہش جوانسان کو ستاتی ہے وہ شہوت ہے۔ ویمنا نے کیا خوب کہا ہے

شہوت انسان کو کتّے کی طرح بے چین رکھتی ہے

تمہاری شہوتیں تمہارے لئے اذیت ہیں۔

جب تک تم ان پر غور نہ کرو گے

تب تک تمہارے لئے سکون ونجات ممکن نہیں

ویمنا کے اس خیال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خواہشاتِ انسانی انسان میں جذبہء گناہ کا ارادہ پیدا کرتی ہیں۔ وہ بد سے بدتر ہوتا جاتا ہے۔ ویمنا کی نظروں میں اس کا ازالہ جذبۂ احسان سے ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

تیرااحسان تیرے گنا ہوں کی پردہ پوشی کرے گا
اس دنیا میں تیری نجات کا وہی ایک ذریعہ ہے
وہی تیرا ساتھی ہے
اور تیرا آسرا بھی ہے

(ویمنا پدیارتا کرمولو،ص: ۲۱۴)

گناہ گاروں کو نیکوکار بننے کی تلقیں کرتے ہوئے لکھتا ہے:

عمر کے بڑھنے کے ساتھ انسان کو اپنے گناہوں سے
باخبر ہونا چاہیے' خود میں وحشی کو پہنپنے نہ دینا چاہیے۔
اور راست طریقۂ زندگی اپنائے
سکونِ قلب حاصل کرنے کی کوشش کرے

(ویمنا پدیارتا کرمولو،ص: ۱۰۵)

نیک لوگ اہل دل ہوتے ہیں۔ ویمؔا کی نظروں نے اہلِ دل کو دنیا میں کم دیکھا اور اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے ان کی تعریف کی ہے۔ ویمؔا یہ دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اہلِ دل کی تعداد کتنی کم ہے۔

ایسا انسان کہیں دکھائی نہیں دیتا
جو اپنے دل کو پہچانتا ہو
ایسا انسان مشکل سے ملتا ہے
جو اپنے دل سے آگاہ ہو

(ویمنا پدیارتا کرمولو،ص: ٦۴)

دل کو قابو میں لا کر انسان اپنی انسانیت کی منزلیں طے کرتا ہے اور نجات حاصل

کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ویما کہتا ہے:

جو اپنے دل کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے

اس کو سکون حاصل ہو جاتا ہے

اور اس کو نجات بھی مل جائے گی

(ویمنا پدیارتا کر مولو ص: ۱۱۶)

ویما کا یقین تھا:

دل کی قوتوں میں سکون جنم لیتا ہے

وہ لوگ جو اپنے دل کو نہیں پہچانتے

اور خیالات پر قابو نہیں پاتے

خود کو موت کے حوالے کر دیتے ہیں

(ویمنا پدیارتا کر مولو ص:۱۷۱)

۲.۳۔ خدا کا تصوّر:

خدا پرستی انسان پر واجب ہے اور یہ فطرتِ انسان کا تقاضا بھی ہے۔ کیوں کہ آدمی خدا پرستی کے بغیر انسان نہیں بن سکتا۔ انسان کی مذہبی زندگی کی نشو نما میں رسم پرستی ہمیشہ حائل رہی ہے۔ انسان رسومِ ظاہری کو خدا پرستی سمجھنے لگتا ہے۔ دنیا شاہد ہے کہ ظاہر پرستوں اور خدا پرستوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ رسم پرستی انسان میں توہمات کو جنم دے کر ذہن کو منجمد کر دیتی ہے۔ اور خدا پرستی انسان میں انسانیت کی قوتوں کو زندہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک میں انسان کھو جاتا ہے، دوسرے میں وہ خود کو پالیتا ہے۔

مذہب پر غور کرتے ہوئے ویما نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ خدا پرستی انسانیت کو

زندہ کرتی ہے اور رسم پرستی انسان کو گمراہ ہی نہیں بلکہ انسان اور انسان کے درمیان فرق پیدا کرتی ہے۔ انسان کی بھلائی کا راستہ رسم پرستی کا راستہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اس پر چل کر نہ وہ نیکی کما سکتا ہے اور نہ ہی سکون قلب حاصل کر سکتا ہے۔ ویمنا لکھتا ہے۔

مذہبی رسمیں فریب کے پھندے ہیں
تو ان سے روح کے بندھن توڑ نہیں سکتا
دانش ور وہی ہے جو ان کو توڑ دے!

(ویمنا پدیارتنا کرمولو، ص:۲۲۱)

ویمنا کے خیال میں رسم پرستانہ ذہنیت انسان کی روحانی غلامی کا باعث ہوتی ہے۔ اس خیال کو وہ یوں بیان کرتا ہے۔

نہ سر مونڈنے سے، نہ لمبے بالوں سے
نہ راکھ ملنے سے، نہ جپ کرنے سے
انساں میں آتی ہے بزرگی
صرف اور صرف باطن کی صفائی سے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۳۴۷)

رسم پرستی خدا پرستی کی جڑ کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے ویمنا کہتا ہے۔

خدا ہماری روح میں موجود ہے
خدا اور روح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں
خدا ہمارے جسم اور لباس کو نہیں دیکھتا
صرف تن ڈھکنے کے لیے لباس پہنے جاتے

انسانی زندگی کی تشکیل میں رسم پرستی رکاوٹ ہے۔ رسم پرستی انسان کی دشمن ہے اور اس کو غارت کر دیتی ہے۔

ویمنؔا اس امر کو صاف کر دیتا ہے کہ مقدس مقاموں کی زیارت سے انسان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا اور جب تک انسان کے دل میں میل اور کدورت باقی ہے وہ چاہے کتنی ہی مرتبہ زیارت کر آئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس کو اس بات کا علم ہو کہ مذہبی زندگی کا تعلق اس کے قلب کی تہذیب سے ہے۔ کیوں کہ انسان کا دل خدا کا گھر ہے۔ خدا کو دل سے باہر مقدس مقامات میں ڈھونڈنا انسان کا احمقانہ فعل ہے۔ ویمنؔا کہتا ہے۔

کاسی کاسی چلاتے ہیں' اس کی زیارت کرتے ہیں
کیا وہ خدا جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں ہے
اگر تیرا دل صاف ہے
تو وہ وہاں بھی ہے اور یہاں بھی ہے!

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص: ۵۴۵)

ویمنؔا اس بات کا یقین دلاتا ہے:

دل ہمارا ہے جائے سکون!
آدمی جو مقدس مقاموں میں
ڈھونڈتا ہے خدا کو !
صرف احمق ہے وہ

(ویمنؔا پدیارتنا کرمو، ص:۲۴۹)

انسان کو بجائے مقدس مقاموں کے اپنے دل کی چھان بین کرنی چاہئے تا کہ وہ خدا پرستی کی اصل کو محسوس کر سکے۔ ویمنؔا نے اس خیال کو بڑی خوبی کے ساتھ یوں پیش کیا ہے:

گو ہم جنگل جنگل پھریں،

پاکیزگی نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

تو اپنے آپ کو پاک کر

اور اس بادشاہ کے درشن کر

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۲۱)

ظاہر پرستی کے خیال سے انسان بھٹک جاتا ہے اور خود سے غافل ہو کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ایسا انسان مذہب کی روح سے دور ہو جاتا ہے۔

ویمؔا کے نزدیک بت پرستی شرک ہے۔ وہ بت پرستانہ ذہنیت اور عظمتِ توحید سے اچھی طرح واقف تھا۔ لکھتا ہے:

پہاڑوں سے پتھر لاتے ہو

اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو

پھر اسی کے سامنے سر جھکاتے ہو

یہ کیسے بے وخوف ہیں! (ویمؔنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۵۱)

بت پرستی اور خدا پرستی کا مقابلہ کرتے ہوئے ویمؔا ان الفاظ میں اپنے خیالات ادا کرتا ہے۔

پتھر کی مورت بنا کر اندھیرے میں نہ رکھو

اور نہ اس کی پرستش کرو

اے جاہل لوگو، کیا تم نہیں جانتے

خدا دل میں رہتا ہے۔

(ویمؔنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۱۸)

ویمؔا کا یقین تھا کہ بت پرستی انسان اور انسانیت کو دفن کر دیتی ہے۔اس کے برعکس خدا پرستی انسان کے دل میں جنم لیتی ہے۔اس وجہ سے ویمؔا کا مقولہ ہے:

کتنے ہی پرستش کے طریقے ہم کرلیں اختیار
عبادت بغیر اخلاص کے بیکار ہے
مخلصانہ اظہارِ عقیدت
پرستش کا سچا ذریعہ ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۴۰۷)

انسان کا دل خدا کا گھر ہے۔خدا اس میں رہتا ہے۔ویمؔا لکھتا ہے:

اگر وہ خدا کا متلاشی ہے
تو وہ اس کو با آسانی
اپنے اندر پالے گا

لہذا دل کی جستجو میں خدا کی جستجو پوشیدہ ہے۔دل کی تہذیب خدا کے پہچاننے کا راستہ ہے۔ویمؔا کہتا ہے:

اِن آنکھوں سے خدا کو کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟
جو آنکھیں اسے دیکھ سکتی ہیں وہ دوسری ہوتی ہیں
وہ نظر بھی مختلف ہوتی ہے۔
کیا ہم اسے دل کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے؟

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۲۷۴)

دل کی آنکھ خدا کے جلوے کی شہادت دیتی ہے۔ایمان' دل کی آنکھ ہے۔

ویمآ کہتا ہے:

ایمان سے خدااور انسان کا رشتہ جڑ تا ہے

یہی اصل ہے' ہمارے عقیدہ کا یہی دعویٰ ہے

انسان سے یہ قصور ہوتا ہے

وہ اس مخفی قوت کو نہیں جانتا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۶۷)

ویمآ کا یقین تھا کہ انسان اور خدا میں بہت ہی قریبی تعلق ہے۔لکھتا ہے۔

اگر انسان خدا سے محبت کرتا ہے تو

خدا بھی اس سے محبت کرتا ہے

اگر انسان خود سے محبت نہیں کرتا

تو خدا بھی اس سے محبت نہیں کرتا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۴۳)

ویمآ کے اس خیال سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی نجات خود انسان کے ہاتھوں میں ہے۔یعنی یہ کہ انسان کا خدا سے محبت کرنا۔اس سے انسان کی زندگی کی تہذیب سنورتی ہے۔جو انسان اپنے آپ سے سچی محبت نہیں کرتا وہ خدا سے بھی محبت نہیں کرسکتا اور نہ خدا اس سے محبت کرتا ہے۔ایسا انسان اپنی زندگی کے پیام کو نہیں سنتا ، بلکہ وہ زندگی کی الجھنوں میں پھنس کر خود کو بھول جاتا ہے اور خدا سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔انسان اور خدا کے رشتہ کو جوڑتے ہوئے ویمآ انسانوں کے مالک کا ذکر یوں کرتا ہے:

تمام انسانوں کا مالک ایک ہے۔

ایسے میں کیا دوسرے دیوتاؤں کا

احترام بھی واجب ہے؟

(ویمنا پدیارتا کرمو، ص:۱۰۷)

خدا ایک ہے۔ یہی ویمنا کا ایمان تھا۔ خدا کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

اس کا روپ عالمگیر ، وہ لافانی ہے

وہ دل کی ہر کیفیت سے واقف ہے

وہ تیرگی کے سائے سے آزاد ہے

اسی ذات کو خدا کہتے ہیں

(ویمنا پدیارتا کرمو، ص:۱۱۶)

مختلف مذاہب دراصل خدا کے مختلف راستے ہیں۔ ویمنا اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

جانور جدا ہیں مگر دودھ سب کا سفید ہے

پھول مختلف ہیں مگر برائے عبادت ایک ہیں

عقائد الگ ہیں، مگر خدا ایک ہے (ویمنا پدیارتا کرمو، ص:۲۲۲)

انسان کا شک وشبہ خدا پرستی ہی سے دور ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح اس کو دل کا سکون نصیب ہوتا ہے۔ اس خیال کو ویمنا اس طرح ادا کرتا ہے:

اگر وہ دنیا میں رہتے ہوئے

خدا سے آشنا ہوا

تو شک وشبہ سے

کبھی آزاد نہ ہو سکے گا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۵۴)

عقل خدا کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

زندگی کے چکر میں پھنس کر عقل خدا کو پہچان نہیں سکتی

اپنے جسم کو مندر میں تبدیل کر، اپنے پر قابو پا

دنیوی خیالات ترک کر، اپنے دل کی آنکھ کھول

اس طرح تم سب کچھ پالو گے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۲۴۴)

انسان اپنی زندگی میں کئی بار خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ جذبہ خوف ایک نفسیاتی خامی ہے۔ اس کے ہاتھوں سیکڑوں انسان گھائل ہو جاتے ہیں۔ خدا پرستی سے انسان کا خوف دور ہو سکتا ہے۔

تمام خوف لاعلمی کا نتیجہ ہیں

جب خدا میں ہم گھل مل جاتے ہیں

یہ خوف ہمیں چھوڑ دیتا ہے

اے ویما زندہ روح ہی فتح پائے گی

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۲۸۷)

ویما کی نظروں میں وہی انسان زندہ ہے۔ جو خدا میں محو ہو کر زندگی بسر کرتا ہے۔ ویما کہتا ہے۔

ویدوں اور شاستروں کے سننے سے کیا تم بہتر ہو جاتے ہو؟

پھر لڑا آخر مر جاتے ہو

خدا کی بڑائی اور عظمت کو جانو

اس طرح تم حقیقت میں زندہ رہ سکو گے!

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۷۳)

''خدا حق ہے اور حق ایک ہے'' اس خیال کو ویمنا بڑی خوبصورتی سے یوں پیش کرتا ہے:

ذائقے الگ الگ ہیں مگر بھوک ایک ہے

راستے الگ الگ ہیں مگر منزل ایک ہے

پنڈتوں میں اختلاف ہے بے حد مگر

جس کی پرستش کی جاتی ہے وہ اصل میں ایک ہے۔

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۵۴)

جس انسان نے حق کو جان لیا اس نے زندگی پر قابو پالیا۔ ویمنا نے حق کی تعریف یوں کی ہے۔

اگر تو حق سے واقف ہو چکا ہے

تو تجھے محسوس بھی نہ ہوگا کہ

رنج و غم کس کو کہتے ہیں (ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۵۶۸)

حق خدا ہے اور خدا کی ایک اعلیٰ صفت حکمت ہے۔ ویمنا نے اس دقیق خیال کو سلیس پیرائے میں یوں ادا کیا ہے:

اگر تو حق سے واسطہ رکھے

تو حکمت حاصل کرسکتا ہے

حق کو اسی وقت دیکھ سکتا ہے

جبکہ تو حکمت پالیتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۲۹۰)

کیوں کہ

حکمت سے بڑھکر دینا میں کوئی نعمت نہیں

صرف اسی کو حکمت نصیب ہوتی ہے

علم کا مقابلہ علم سے ہوسکتا ہے

حکمت سب سے بہتر ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۱۱۷)

حکمت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ خدا پرستی میں موجود ہے۔

خدا کو دیکھ کر حکمت مکمل ہو جاتی ہے

انسان خود کو دیکھ کر دھوکے میں پھنس جاتا ہے

خدا کو جان لے گا تو خود کو پہچان لے گا

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۱۲۵)

خدا کا کوئی روپ نہیں وہ بے روپ ہے۔ ویمنا کا کہنا ہے:

کمبل گھنٹیاں پازیب، گنجا سر

یہ سب خدا پرستی کے لئے بے سود ہیں

کیوں کہ خدا کا وجود

غیر مادّی ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۶۴۵)

خدا کی قربت حاصل کرنے کے جذبہ کو ویمنا یوں بیان کرتا ہے۔

ایک سچے یوگی کے لئے ضروری ہے

وہ خدا سے اس طرح ملے

جیسے ایک مرد عشق میں ڈوب کر

اپنی عورت سے ملتا ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۴۰۱)

خدا کے تصوّر کے تعلق ویمنا کے خیالات کو جی. وی. کرشنا راؤ نے اپنی کتاب ''ویمنا، شاعری و فلسفہ'' میں پیش کیا ہے' جسے نارلا نے اپنی تصنیف ''ویمنا'' میں یوں درج کیا ہے:

" God , living in the heart of everything, is not altogether different from man . when he has a vision of God to him , when he complr'tely loses himself in him , by getting rid of his ego and passions. he is one with God. Nay, he is God himself. people who do not understand this principle seek him in temples and other sacred places......It is right here in and around man: he has to seek it and realise it writhin himself" .

(vemana .page.62.)

ترجمہ:

'' خدا ہر انسان کے دل میں رہتا ہے، وہ کہیں دور نہیں ہے۔
جب انسان کو خدا کی بصیرت عطا ہوتی ہے تو وہ اپنی انا، ہوس
، یہاں تک کہ اپنے آپ کو اس میں فنا کر دیتا ہے۔ وہ خدا کا
ایک جز ہو جاتا ہے۔ نیز وہ خدا بن جاتا ہے۔ جو لوگ اس
حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ مندروں اور مقدس مقاموں میں خدا کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔۔وہ تمہارے قریب اور آس
پاس ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر خدا کو ڈھونڈے اور
پہچانے۔'' (ویمنا، ص:۶۲)

ویمنا کا یقین تھا کہ خدا ایک ہے اور وہ ہر انسان کے دل میں موجود ہے۔ اس کو جانے بغیر کسی کو نجات نہیں مل سکتی۔ اور انسان خدا کی ذات میں فنا ہو کر ہی خود کو دائم و باقی رکھ سکتا ہے۔

اختتامیہ:

ویمنا ایک ایسے مذہبی دور میں زندگی بسر کرتا ہے، جس میں ہندو مذہب فرقہ پرستی میں بٹ چکا تھا۔ اس پس منظر میں حق کا متلاشی ویمنا مذہب سے متاثر ہوتا ہے اور اس سے بیزار بھی۔ مختلف مذاہب کی ریاکاریوں اور ظاہر پرستیوں سے وہ ادب چکا تھا۔ ایک خدا پر اس کا کامل ایمان تھا۔

ویمنا نے توحید کے راستہ پر چل کر انسانی تہذیب کی تربیت کرنے کی کوشش کی تھی۔ انسان کو اپنی اصلیت سے آگاہ کرایا اور یہ محسوس کروایا کہ انسان کی ترقی کے لئے خود شناسی ضروری ہے اس نے انسانیت کا اعلیٰ معیار طئے کرنے کے ساتھ ساتھ انسانِ کامل

کے درجہ بھی متعین کئے اور انسانی اقدار کو قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ایک ذمہ دار انسان بن کر انسانی تہذیب کو آگے بڑھانے کا سبق سکھایا اور تمام انسانوں کو ایک ہوکر زندگی گزارنے کی تاکید کی۔

ویماؔ نے لوگوں کو زندگی گزارنے کے جھوٹے طریقوں، جھوٹے رسم رواج تو ہمات وغیرہ کی زنجیروں سے آزاد کرایا۔ نیکی اور بدی کے فرق کو صاف صاف واضح کیا اور یہ پیغام دیا کہ انسان فرضی لذتوں اور خواہشوں میں پھنس کر اپنی زندگی کو برباد نہ کرے۔ ویماؔ زندگی کی حقیقت کو سمجھ کر زندگی گزارنے کو سب سے بڑا فن قرار دیتا ہے۔

ویماؔ نے خدا پرستی کی ضرورت محسوس کیا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ خدا ایک ہے' وہ انسان کے دل میں رہتا ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ بت پرستی اور کئی خداؤں کی عبادت کے تصوّر کو ویماؔ بیکار قرار دیتا ہے۔ ویماؔ نے ساری دینا کے انسانوں کو اس عقیدہ سے آگاہ کیا کہ انسان، کا دل ہی خدا کا گھر ہے' اس کا ایمان تھا کہ انسان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ خدا کو پہچان نہ لے اور خود کو اس میں فنا نہ کردے۔

بابِ پنجم

امجد کی شاعری کے فنّی محاسن

حضرت امجدؔ اور شاعری:

شاعری تمام فنونِ لطیفہ کی سرتاج ہے۔ دیگر فنونِ لطیفہ کے مقابلہ میں' شاعری میں جذبات کو بہتر اور موثر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ انسان اول سے باضابطہ طور پر زبان ہی کے ذریعہ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار کرتا آرہا ہے۔ اور شاعری زبان کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ غرض شاعری کے ذریعہ انسانی جذبات کی بہتر اور بھرپور عکاسی کی جا سکی ہے۔ ساری دنیا کا ادب خود اس بات کا شاہد ہے۔

شعر گوئی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فن لطیف ہے جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اس کے لئے ایک فطری اور خالص جذبہ درکار ہے۔ ایک فطری اور حقیقی شاعر ہی اس فنِ شریف کے ساتھ انصاف کر سکتا ہے۔ وہ شاعر' جس کے پاس بے جان الفاظ میں روح پھونکنے کی قوت ہوتی ہے جسے پڑھ کر قاری کے اندر ایک وجد آفرین کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس کے کلام میں ایسی تاثیر پائی جاتی ہے' وہی صحیح معنوں میں مخلص و فطری شاعر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ حضرت امجدؔ حیدر آبادی کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔

حضرت امجدؔ اردو کے ان چند باکمال اور صاحبِ دل شاعروں میں سے ہیں' جنہیں زمانہ ایک مدت بعد پیدا کرتا ہے۔ اللہ نے ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر شاعرانہ احساسات بھر دیئے تھے۔ ان کا کلام فطرت کے قریب اور حقائق سے لبریز ہے۔ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے جب تک کہ کوئی کیفیت ان کے دل و دماغ پر طاری نہ ہو جاتی۔

حضرت امجدؔ کے چار شعری تصانیف: ۱۔ رباعیاتِ امجدؔ۔ حصّہ اول' حصّہ دوم'
[illegible]

ہیں ۔ان کو پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خدا نے شاعرانہ دل و دماغ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ زبان میں وہ تاثیر بھی دی ہے جس سے قاری اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پروفیسر وحید الدین سلیم نے اپنے مضمون ''دکن میں ایک رباعی گو شاعر'' میں حضرت امجدؔ کے کلام کی صداقت اور اس کے فطری اظہار کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ان شاعروں میں سے نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں ۔ ان کے کلام میں جا بجا بجلی کوندتی نظر آتی ہے۔ جو اہل بصیرت کے لئے ہوش ربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں ۔ خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے ۔ اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے ۔ قدرتی شاعری کی یہ پہچان ہے۔'' (ارمغانِ امجدؔ۔ صفحہ ۷۰)

حضرت امجدؔ نے اپنی شعری تصنیف ''خرقۂ امجد'' کے دیباچہ میں شاعری کے متعلق اپنے تصورات اور خیالات کو پیش کیا ہے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا شعری مذاق کس قدر حقیقت سے قریب اور بلند تھا۔ لکھتے ہیں:

''شاعری'' موسیقی' مصوری' فنونِ لطیفہ ضرور ہیں' مگر نا اہلوں نے کثیف سے بھی کثیف بنا دیا ہے۔ مجھ سا بے شعور بھی شعر کہتا ہے۔ ہر لڑکا گلیوں میں گاتا پھرتا ہے۔ مکتب کے بچے بھی تصویر بناتے ہیں۔ وزن کے اعتبار سے شعر' لحن کے اعتبار سے راگ' آنکھ' ناک کے اعتبار سے تصویر تو ضرور ہے۔ کیا کوئی صاحبِ فن ان کو فنونِ لطیفہ میں شمار کر سکتا ہے۔۔۔۔

شعر ہو یا راگ، جب تک سامع کو بے خود نہ کر دے، بار دفطرت میں حرارت نہ پیدا کر دے، قدیم کافر کو مسلمان نہ بنا دے، کثیف مادہ میں لطیف روح نہ پھونک دے، فنونِ لطیفہ میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ ہر شعر مکمل راگ با تصویر ہوتا ہے۔ جس طرح تصویر میں مصور ہر عضو اپنی اپنی جگہ خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح شاعری کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطع نظر تناسب اور توازن بھی ضروری ہے۔ اور لازمی چیز ہے۔ اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کر دی جائے تو تعداد اجزا کے اعتبار سے تصویر مکمل تو ہوگی۔ مگر مضحکہ خیز۔ اسی طرح موزوں نظم بھی اپنی بدنظمی، اور غیر مناسب اور ثقیل الفاظ، اور دراز فہم استعارات اور تلمیحات کی وجہ سے ''شعر گفتن چہ ضرور بود'' کا مصداق ہو جاتی ہے۔

جب تک اصل فطرت **فطرة الله التی فطر الناس علیها ہ** : اظہار مافی الضمیر پر مجبور نہ کرے اور نہ ذوقِ طبیعت متقاضی نہ ہو، قافیہ ردیف کے بل پر شعر کہنا، نقالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے۔''

مقصدِ شعر کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

''شاعری نہ ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے، نہ واجباتِ دینی میں۔ اس کے پیچھے وقت خراب کرنا اور فی کل وادٍ یھیمون کا مصداق بننا، وقت کی قدر کرنے والوں کے لئے تو مناسب نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے: اشعار سے پیٹ بھرنے کی

پیپ پیٹ بھرنا اچھا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس
جگہ اشعار سے مخرب اخلاق لغو اور لاحاصل اشعار مراد ہیں۔ نظم
ہو یا نثر تقریر ہو یا تحریر' اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ہونا چاہئے' دینی یا
دنیوی خود اپنے لئے یا غیر کے لئے جس نظم و نثر میں اس امر کا
لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی اور خامہ فرسائی کی جائے۔ بازیچۂ
اطفال ہے۔ جس کی تعبیر مشقِ ابتدائی سے کی جا سکتی ہے۔ کہ لکھا
اور مٹا دیا۔''

(خرقۂ امجد، ص:۲،۳،۴،۵)

شاعری کی اصلیت' اہمیت اور مقصدیت کے تعلق سے حضرت امجد نے جو تصورات پیش کئے ہیں' وہ سب خود ان کی شاعری پر صادق آتے ہیں۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے۔ جب تک ان کے دل پر کوئی خاص کیفیت طاری نہیں ہو جاتی تھی۔ جذبہ کی وہی شدّت اشعار کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تاثیر شعر کے بارے میں وہ یوں فرماتے ہیں۔ ان کا قطعہ ہے:

کلام ایسا اکثر سنا ہو گا تم نے
سنا آج اور کل اثر دل میں اترا
کہو شعر ایسا کہ ہو تیز خنجر
ادھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اترا

(پیامِ امجد، ص:۹)

حضرت امجد کا کلام پُر اثر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں لفظی نمائش' قافیہ پیمائی' صنائع و بدائع' وغیرہ ظاہری ارکان کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے خالص جذبات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش

کی ہے۔ رباعیاتِ امجد کے حصہ اوّل کے دیباچہ میں وہ اپنی شاعری کے تعلق سے تحریر کرتے ہیں:

''لطفِ زبان اور لطائفِ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زبان گیر دل شکن حرف گیروں کی خاطر سے میں نے اپنے مذاق میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ محض ضمیر کی اس آواز کو (جو مبدٔ فیاض کا فیضان خاص ہے) اپنی زبان اور سادہ لفظوں میں فرضی طور پر ادا کر دیا ہے۔''

(رباعیاتِ امجد حصہ اول ص:۳)

غرض حضرت امجد کے ہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک باکمال اور فطری شاعر کی پہچان ہوتی ہیں۔

حضرت امجد کی رباعی گوئی:

حضرت امجد کا کلام رباعیات کے علاوہ غزلیں نظمیں، نعتیں، تضمین، منقبتیں اور قطعات پر مشتمل ہے۔ ان سب اصنافِ پر آپ کو خاص مہارت حاصل تھی۔ بایں وجہ ان کے کلام میں ہر جگہ ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ تاہم رباعی گوئی میں آپ کو قدرت کامل حاصل تھی۔ بحیثیتِ رباعی گو شاعر اردو دنیا میں آپ کو بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ آپ کی رباعی گوئی پر تفصیلی بحث کرنے سے پہلے صنفِ رباعی کے فن اور اردو رباعی کی نشو نما پر سرسری نظر ڈال لی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس طرح اردو باعی گوئی میں حضرت امجد کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہو جائے گا۔

رباعی کی تعریف:

جا تا ہے۔تاہم رباعی کا نام اس صنف کے لئے معروف ومخصوص ہو چکا ہے۔

لفظ رباعی عربی لفظ ''ربع'' سے نکلا ہے۔جس کے معنی کسی چیز کے چوتھے حصہ کے ہیں۔اس لئے چار مصرعوں والی نظم کو رباعی کہتے ہیں۔رباعی کا پہلا' دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔تیسرے مصرعہ کا قافیہ ان سب سے جدا ہوتا ہے۔ رباعی کا مرّدف ہونا بھی ضروری نہیں ہے' صرف قافیہ کافی ہے۔اس ہیت میں لکھی جانے والی رباعی کو خصّی رباعی کہتے ہیں۔جو عام طور پر لکھی جاتی ہیں۔مثلاً حالیؔ کی یہ رباعی دیکھئے۔

دولت کی ہوس ، اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص ، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہو تو ہے یہ شاہنشا ہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

(یادگارِ حالی،ص:۱۹۲)

رباعی کی اس مروجہ ہیت میں دو تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔پہلی تبدیلی ''رباعی مستزاد'' کی ہے۔جس میں ہر مصرعہ کے بعد ایسا فقرہ لایا جاتا ہے جو اسی مصرعہ کے رکن اوّل اور رکن آخر کے برابر ہوتا ہے۔اگر اس اضافی فقرہ کو نظر انداز کر دیں تو بھی رباعی کے مصرعوں میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔رباعی کے مصرعوں میں چونکہ ارکان زیادہ کئے جاتے ہیں اس لئے ایسی رباعی کو رباعی مستزاد کہتے ہیں۔مثلاً دردؔ کی یہ رباعی دیکھئے۔

گر شوق ہے جی میں حق کے پہچاننے کا ابرام کرو
کہتا ہوں سخن جھوٹ سا پر ماننے کا اک کام کرو

ہے خیر اگر تم میں تو لازم ہے تمہیں پہچانو اسے
اگر تم ہی ہو تو فائدہ کیا جاننے کا دل رام کرو

(دکنی رباعیاں،ص:۱۳)

رباعی کی ہیت میں دوسری تبدیلی ''رباعی غیر خصّی'' کی کی جاتی ہے۔ اس رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔یعنی تیسرے مصرعہ کا قافیہ جدا نہیں ہوتا' جیسا کہ عام طور پر خصّی رباعی میں ہوتا ہے۔اردو میں فراؔق کے یہاں غیر خصّی رباعیوں کی مثالیں مل جاتی ہیں۔لیکن بہت کم۔مثلاً

ہے چشم سیاہ کی تھرتھراتی ہوئی رات
ہے ذوقِ گناہ کی جگمگاتی ہوئی رات
ہے زلف کے پیچ و تاب کھائی ہوئی رات
رس کے جوبن میں گن گناتی ہوئی رات

(دکنی رباعیاں،ص:۱۴)

مستزاد رباعی کی طرح غیر خصّی رباعیات بھی بہت کم لکھی گئی ہیں۔عام طور پر خصّی رباعیات لکھنے کا رورواج ہے۔

رباعی کا فن:

اردو کی تمام اصنافِ سخن میں' رباعی کا فن سب سے مشکل ترین فن سمجھا گیا ہے۔ رباعی ایک مخصوص بحر''بحرِ ہزج'' میں کہی جاتی ہے۔اس بحر کے شجرہ اخرب کے بارہ اور شجرۂ اخرم کے بارہ اوزان یعنی پورے چوبیس اوزان ہوتے ہیں۔ایک ہی رباعی کے ہر مصرعہ میں الگ الگ اوزان استعمال کئے جاسکتے ہیں۔تاہم یہ ضروری ہے کہ رباعی کے مقررہ

چوبیس اوزان میں سے کسی ایک وزن میں رباعی کہی جائے۔ ورنہ وہ رباعی نہیں کہلائے گی۔ اور یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ رباعی کا وزن صرف ''لاحولا ولا قوة الاّ باالله'' ہے۔ یہ رباعی کے چوبیس اوزان میں سے ایک وزن ہے۔

رباعی کہنے کے لئے شاعر کو بڑی مشق کرنی پڑتی ہے۔ اسی لئے شاعر عموماً رباعی اس وقت لکھنا شروع کرتا ہے جب وہ دوسرے اصنافِ سخن پر قابو پالیتا ہے۔ رباعی کی فنی مشکلات کے سلسلہ میں جوشؔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

> ''رباعی کہنا بڑا ہی مشکل ہے۔ یہ وہ کم بخت صنفِ سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو بر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس و مفکر زندگی کے تقریباً چالیس یا پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہیں۔''

(بہ حوالہ اردو رباعیات، ص: ٦٦٠)

رباعی کے پہلے مصرعہ میں شاعر ایک خیال پیش کرتا ہے۔ جس کے بعد کے دو مصرعوں میں خیال کو بڑھا کر چوتھے مصرعہ میں انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے۔ اس مصرعہ پر رباعی کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ مصرعہ پوری رباعی کو اونچا اٹھا دیتا ہے یا پھر وہ پوری رباعی کو لے ڈوبتا ہے۔ شاعر چوتھے مصرعہ کو وز ن دار بنانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی تین مصرعے کم اہم ہوتے ہیں۔ رباعی کے چاروں مصرعوں میں ربط ہونا ضروری ہے۔ ایک مصرعہ بھی بے اثر ہو جائے تو اس کا اثر پوری رباعی پر پڑتا ہے۔ ان سب کے علاوہ کامیاب رباعی کے لئے بلا کی روانی اور تاثیر ہونا ضروری ہے۔ ان سب تقاضوں اور پابندیوں کا اہتمام کرتے ہوئے کامیاب رباعی لکھنا' فکر کے کہسار سے جوئے شیر لانے

کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو رباعی گوئی میں کامل عبور رکھنے والے شاعر بہت کم ہوئے ہیں۔ علامہ کیفی لکھتے ہیں:

''اصنافِ سخن میں رباعی کا درجہ جو کچھ بھی ہو اس میں طبع آزمائی اور پھر کامیابی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی گو شعراء بہت کم ہوئے ہیں جو انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔''

(بحوالہ اردو رباعیات، ص: ۲۶۳)

رباعی ایک فنِ دقیق ہونے کے باوصف اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جس کی وجہ سے اردو شاعری میں اس کی ایک خاص شناخت بنی ہوئی ہے۔ رباعی میں بلند سے بلند خیال کو اختصار و موثر طرز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس کے چار مصرعوں میں زورِ بیان کا جو وصف پوشیدہ ہے اس کی مثال دوسری اصناف میں بجز غزل کے اور کسی میں کم ہی دیکھی گئی ہے۔ یہ اس کا وصفِ خاص ہے۔ رباعی میں منظر نگاری' محاکات' جذبات نگاری' فطرت نگاری وغیرہ کی بھی گنجائش ہے۔ رباعی جہاں اپنے فن کے اعتبار سے سحر انگیز ہے وہیں موضوعات کے اعتبار سے بھی منفرد ہے۔ اس خصوص میں وہ اپنے اندر ایسی لوچ رکھتی ہے کہ اس میں خمریاتی' عشقیہ' اخلاقی' مذہبی' عارفانہ' فلسفیانہ وغیرہ ہر قسم کے موضوعات کو پُر اثر انداز میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ رباعی کی اہمیت اور مقبولیت کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل ہی ہے۔ جس کو اردو شاعری میں وہی مقبولیت حاصل ہے جو جسم کے اندر دل کو حاصل ہے۔ تاہم رباعی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ رباعی مختصر صنفِ سخن ہونے کی وجہ سے مفید ثابت ہوتی ہے۔ بہت سی باتیں جو دو مصرعوں میں نہیں کہی جاسکتی

چار مصرعوں میں ادا ہو جاتی ہے چار مصرعے یا چار سطروں
والی شاعری دنیا کے مختلف ادب میں پائی جاتی ہے۔ اور اس
نے ہر جگہ مقبولیت حاصل کی ہے۔''

(اردو رباعیات ص:۸۸)

غرض رباعی ایک مشکل ترین صنف ہونے کے باوصف اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک کامیاب صنف کے لئے ضروری ہیں۔

اردو میں رباعی گوئی:

غزل کی طرح رباعی بھی اردو میں فارسی سے آئی ہے۔ فارسی شعراء حکیم عمر خیامؔ ہوں یا سرمدؔ، بابا افضل کوہی ہوں یا بابا طاہر عریاںؔ، ابوسعید ابی الخیر ہوں یا امام سعدیؒ یا پھر جامیؔ، صنفِ رباعی نے ان کے دم سے حیاتِ ابدی پائی ہے۔ اور ان ہی کی بدولت اس صنف نے فارسی ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ فارسی کی رباعیات کی ساحری نے اردو کے بڑے شعراء کو اپنے طرف متوجہ کیا۔ اس طرح اردو میں بھی اس صنف کی آبیاری ہونے لگی۔

دکن میں جہاں اردو کی مختلف اصنافِ سخن نے ترقی کی ہے' وہیں رباعی نے بھی اپنی راہ بنائی ہے۔ دکن کے رباعی گو شعراء نے زندگی کے رنگا رنگی تجربات کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اخلاقی' صوفیانہ' عاشقانہ' خمریاتی' مدحیہ وغیرہ ہر قسم کی رباعیاں کہیں۔ فیروزیؔ' محمد قلی قطب شاہ' غواصیؔ' وجہیؔ' نصرتیؔ وغیرہ نے دکنی اردو میں خاص تعداد میں رباعیاں لکھیں۔ مثال کے طور پر ملا وجہیؔ کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

تج یاد بنا ہور منجے کام نہیں
نس جاگتے جاتی ہے دن آرام نہیں

میں تو تجھے منگتی (ہوں) ادکھ جیو دلے

توں کیوں منجے منگتا ہے سو کچ فام نہیں

(دکنی رباعیاں،ص:۵۶)

جس طرح اردو نے اپنا بچپن دکن میں گزارا اور جوان ہوتے ہوتے شمالی ہند پہنچ گئی' اسی طرح صنف رباعی کی شروعات یہاں ہوئی مگر شمالی ہند کے شعراء نے اس صنف کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

اردو میں ابتداء ہی سے ہر شاعر صنفِ رباعی کی طرف توجہ کرتا آیا ہے۔ سب سے پہلے میر تقی میر نے رباعی کو ترقی کی راہ پر لگایا۔ ان کی رباعیوں میں وہی سوز گداز ہے جو ان کی غزلوں کا وصف خاص ہے۔ ان کے ہم عصر دردؔ نے بھی کئی متصوفانہ رباعیات کہی ہیں۔ لیکن رباعی کو اپنا بھرپور رنگ و آہنگ مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ نے عطا کیا۔ مرزا دبیر نے سب سے پہلے رباعی میں اخلاقی اور مذہبی موضوعات کو شامل کیا تھا۔ میر انیسؔ کی رباعیوں میں تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

میر انیسؔ کی یہ رباعیاں ملاحظہ ہو۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے

بلبل کی زبان پہ گفتگو تیری ہے

ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا

جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی

ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

(رباعی،ص:۴)

مرزا دبیر میر انیس کے بعد حالی، اکبر، سید عبدالغفور اور شہباز نے رباعی کی طرف خصوصی توجہ کی ۔ انہوں نے اس میدان کو مزید وسعت بخشی ۔ اکبر کی رباعیوں میں ان کا مخصوص طنزیہ انداز ملتا ہے ۔ جو ان کی پوری شاعری کا وصف ہے ۔ حالی کی رباعیوں میں بھی ان کی شاعری کی طرح اصلاحی رنگ نمایاں ہے ۔ اور شہباز نے سائنسی اور اصلاحی موضوعات کو رباعی میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔ ان تینوں کی رباعیوں میں مذہب اور مذہبی اخلاق کے علاوہ سائنسی، وطنی، سیاسی اور سماجی مسائل بھی ملتے ہیں ۔

اس کے بعد اردو میں رباعی لکھنے کا رواج عام ہوتا گیا ۔ اردو کے قابلِ ذکر رباعی گو شعراء ہیں: امجد حیدر آبادی، شفیق عماد پوری، ترلوک چند محروم، آسی الدنی، قتیل دانا پوری، لالہ جگت نارائن رواں، جذب عالم پوری، گرسرن لال ادیب، فراق گورکھ پوری، جوش، ملیح آبادی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان شعراء نے رباعی میں حسن و عشق، مذہب، اخلاق، تصوف، سماج، سیاست، اور سائنس کے موضوعات پر لکھنے کے علاوہ ہندوستانی تہذیب اور اس کے رنگ روپ سے اردو رباعی کو مالا مال کیا۔

اردو رباعی گوئی کی تاریخ میں امجد حیدر آبادی کا نام اہمیت کا حامل ہے ۔ ان کی رباعیات فنی اعتبار سے فارسی رباعی گو شعراء کے ہم پلہ نظر آتی ہیں ۔ مرزا دبیر اور میر انیس نے اردو رباعی گوئی کی جس روایت کو آگے بڑھایا، امجد حیدر آبادی نے صرف اس کا تحفظ کیا بلکہ اسے ایک خوبصورت موڑ بھی دیا۔

جذب عالم پوری نے ایک رباعی میں حضرت امجد کی رباعیات کی عظمت کا

اعتراف کچھ اس انداز میں کیا ہے:

ہو فضلِ خدا تو عرش تک پہنچیں گے
ہرگز نہ مضامین کے لئے ترسیں گے
ہے سر پہ ہمارے دستِ فیض امجؔد
ہم صنفِ رباعی کو نہ مرنے دیں گے

(امجد نمبر ص:۲۶)

سید وحید اشرف نے اپنا مجموعہ ''رباعی'' (حصہ دوم) میں اردو رباعی گو شعراء کا مختصر تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اہم رباعی گو شعراء کا مقام طئے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مرزا دبیؔر اور میر انیسؔ کو اردو رباعی میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ رہبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امجؔد حیدر آبادی' قتیل دانا پوری' گرسرن لال ادیب کو اردو رباعی گوئی کی تاریخ میں صنف اوّل میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ ان کے بعد آسی الدنی' حالی' اکبر' ترلوک چند محرؔوم، لالہ جگت موہن لال رواؔں کا نام آتا ہے۔''

(رباعی حصہ دوم ص:۹')

اردو رباعی گوئی کا جائزہ لینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صنف وہ مقام حاصل نہ کر سکی جیسے اردو غزل نے حاصل کیا۔ بہت کم شاعر ایسے ہیں جنہوں نے رباعی کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی ہے۔ حضرت امجؔد ہی اردو کے وہ تنہا معروف و مقبول شاعر ہیں جنہوں نے رباعی کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے اردو رباعی کو بامِ عروج پر لے جانے کی

پوری سعی کی ہے۔ ان کی رباعیات اردو شاعری کا ایک انمول سرمایہ ہیں۔

رباعیاتِ امجد کی خصوصیات:

حضرت امجد اردو رباعی گوئی میں بلند و اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ فکری وفنی اعتبار سے ان کی رباعیات ادب عالیہ میں شمار ہوتی ہیں۔ قدرت نے آپ کو اس صنف میں خاص دست رس عطا کی تھی۔ آپ نے ابتداء سے لے کر دمِ آخر تک مستقل اس صنف کے ذریعۂ اپنے جذبات و مشاہدات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حضرت امجد وہ پہلے اور تا دمِ تحریر آخری شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں نام پیدا کیا ہے۔ اردو شاعری میں ان کا وہی مقام ہے جو فارسی میں حضرت ابوسعید ابوالخیر اور صوفی سرمد کا ہے۔ ان کی رباعیات میں صوفی سرمد کا رنگ جھلکتا ہے۔ شاید اسی لئے علامہ غلام قادر گرامی نے اپنی ایک فارسی رباعی میں حضرت امجد کو "جوابِ سرمد" کہا ہے۔

امجد بہ رباعی است فردِ امجد
ملکِ امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جوابِ سرمد امروز
روح سرمد بہ گفت امجد امجد

(ارمغانِ امجد، ص:٦٩)

خود حضرت امجد کو اس بات کا احساس تھا۔ وہ ایک رباعی میں اس خیال کو یوں ادا کرتے ہیں۔

سید احمد حسین امجدؔ ہوں میں
امجدؔ ہوں میں جواب سرمدؔ ہوں میں
کوندی ہوئی ہے نور سے مٹی میری
خاکِ قدمِ پاک محمدؐ ہوں میں

حضرت امجدؔ نے اپنی رباعیات میں اخلاقیات' انسانیت کا احترام اور روحانی تعلیم کا درس دیا ہے۔ اپنے کلام کے ذریعہ انہوں نے جس صداقت کو پیش کیا ہے وہ سارے عالم کے لئے روشنی عطا کرتی ہے۔ جو ان کے دل میں تھا وہی ان کے زبان وقلم پر بھی آیا۔ ان کے ہاں عام شاعروں کی طرح دل اور زبان میں تضاد نہ تھا۔ اور یہ ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اور عالمی صداقت کی دلیل بھی۔ ان کے ہاں تصنع تھا نہ ظاہری نمائش۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دائمی تاثیر پائی جاتی ہے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے جب تک کوئی کیفیت ان کے دل ودماغ پر طاری نہیں ہو جاتی اور اسی کیف ومستی کے عالم میں وہ شعر کہتے تھے۔ لہذا قاری ان کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دراصل تاثیر شعر ہی جانِ شاعری ہوتی ہے۔ حضرت امجد کے ہم عصر شعراء اور ادیبوں نے ان کے خلوص اور تاثیر کلام کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا عبدالقدیر صدیقی لکھتے ہیں:

''ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت۔ کتنے عمیق مشاہدہ کے بعد ایک زبردست لکچر کا خلاصہ رباعی میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر اس عنوان کو ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔ یہ چیزیں نہ تعلیم سے حاصل ہوتی ہیں نہ تعلم سے۔''

(بحوالہ حیاتِ امجد ، ص: ۱۱۲)

حضرت علامہ اقبالؔ نے حضرت امجدؔ کی رباعیات کی متعلق اپنا تاثر یوں پیش کرتے ہیں۔

''ہر رباعی قابلِ داد ہے' جن کے پڑھنے سے ایک قسم کی روحانی مسرت نصیب ہوتی ہے۔''

(بحوالہ حیاتِ امجد ص: ۱۱۱۔)

چناں چہ تاثیرِ کلام ہی حضرت امجدؔ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

حضرت امجدؔ کا کلام پُر اثر ہونے کے علاوہ نہایت سلیس و عام فہم ہوتا ہے۔ حضرت امجدؔ مشکل پسند مضامین کو بھی سہل انداز میں پیش کرنے کے فن سے واقف تھے۔ ان کے کلام کی سادگی اور روانی کا یہ عالم ہے کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے۔ غرض سلاستِ کلام حضرت امجدؔ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ایک خط میں وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت امجدؔ کی یہ عبارت ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مضمون ''خضرِ وادئ تصوف'' میں موجود ہے۔

''میری رباعیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان ایسی ہوتی ہے جس کو ہر فرد و کلاں بغیر کسی دقت کے سمجھ سکتا ہے اور میرا نصب العین یہ ہے کہ ناظرین کو سکونِ قلب حاصل ہو اور توفیقِ الٰہی تائید کرے تو قوتِ عمل پیدا ہو۔ واہ' واہ میرا مقصد نہیں ہے' مجھے تو صرف آہ چاہیئے۔

(امجد نمبر ص:۵۶)

آپ کی دوسری اہلیہ جمالِ سلمٰی جن کے علم و عرفان سے آپ بے حد متاثر تھے وہ بھی آپ کی شاعری کی کامیابی کے متعلق جو رائے دی ہے وہ بھی سلاست پر مبنی ہے۔

حضرت امجد کی شاعری پر لکھے گئے مختلف ادیبوں کے تبصروں کو دیکھ کر وہ اپنی رائے یوں پیش کرتی ہیں:

> ''ان تمام تبصروں سے آپ کے کلام پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑ سکتی اور آپ کی شاعری کا نقطۂ نظر معلوم نہیں ہوسکتا۔۔۔ میری رائے ان سب سے بالکل لگ ہے۔ سلاستِ الفاظ اور نثر نما ترکیبوں کی وجہ سے اہم سے اہم مسئلہ بھی آپ کی رباعی کے قالب میں ڈھل کر پایۂ اہمیت سے اتر جاتا ہے۔ کثیر التعداد عوام کے فائدہ کے لئے ہونا بھی یہی چاہئے کہ کلام کا راستہ پیچیدہ' معلق' عالمانہ اور صوفیانہ اصطلاحات کے روڑوں سے پاک و صاف ہو کر شارع عام ہو جائے' جس پر ہر ادنیٰ اور اعلیٰ مبتدی منتہی با آسانی گزر سکے۔''

(جمالِ امجد ص:۱۸۳۔۱۸۴)

حضرت امجد کے کلام کی سلاست کی چند مثالیں پیشِ نظر ہیں۔

خالقِ کائنات کے متعلق بہت سے پے چیدہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ دیکھئے وہ اس مبہم موضوع کو کس سلیس انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ایسا لکھا ہے جیسے کوئی باتوں باتوں میں اس مسئلہ تصوف کو حل کر رہا ہو۔

ہر وقت فضائے دل کشا دیکھتے ہو
صحراو چمن' ارض وسما دیکھتے ہو
مخلوق میں نیرنگئ خالق دیکھو
قرآن پڑھو، جلد کو کیا دیکھتے ہو

اہل دل، دل کو خدا کا گھر مانتے ہیں۔اس خیال کے بیان کی سادگی ملاحظہ ہو۔

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں
اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی کھٹک سے آہٹ
دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۹)

شاعر اپنے کلام کو موثر اور عام فہم بنانے کے لئے تشبیہات، استعارات، تمثیلوں، وغیرہ کا استعمال کرتا ہے۔ان کا استعمال کس فنکارانہ چابکدستی سے ہوتا ہے، وہ شاعر پر منحصر ہے۔حضرت امجدؔ نے لطیف تشبیہوں اور تمثیلوں سے کلام میں ندرت پیدا کی ہے۔

اکثر کم ظرف انسان کو کسی ظرفِ خالی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔تاہم حضرت امجدؔ نے اس کو حباب اور تنکے سے تشبیہ دے کر اس کی حقیقی خصلت کو واضح کر دیا ہے۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑجاتا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص:۴۴)

ایک اور رباعی میں صبر کو قفل کی کلید سے تشبیہ دی ہے۔

بے صبر کی جان ہمیشہ گھبراتی ہے
تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے
آساں ہوتی ہے صبر سے ہر مشکل

ہر قفل میں یہ کلید ٹھیک آتی ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص: ۶۰)

حضرت امجد کے یہاں تمثیلی انداز بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا حکیمانہ استدلال قابل داد ہے۔ وہ جس بات کو بیان کرتے ہیں اس کے ثبوت کا خوب حق ادا کرتے ہیں۔ درجِ ذیل رباعی میں بیان کی بے ساختگی ملاحظہ کیجئے۔

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص: ۶۶)

کہو وہ بات جس میں ہو کرامات
سخن ہی حاصل دنیا و دین ہے
نہ کیجئے سخت بات امجد کسی سے
زبان میں دیکھئے ہڈی نہیں ہے

(ریاض امجد، حصہ دوم، ۵۸)

حضرت امجد کے کلام میں شوخی وظرافت بھی موجود ہے۔ اس خصوصیت نے ان کے کلام کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ ایک رباعی میں اپنے رب کریم کے آگے اعترافِ گناہ کا اظہار کس قدر شوخیانہ انداز سے کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

تو ہے کہ ہمیشہ رحم فرماتا ہے
امجد ہے کہ راہ پر نہیں آتا

میں خوگرِ جرم تو کرم کا عادی
ہم دونوں میں دیکھیں کون بڑھ جاتا ہے

(گلستانِ امجد، ص:۱۷۸)

ایک اور رباعی میں کس معصومیت کے ساتھ خدا سے شوخی کرتے ہیں، دیکھئے:

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکرِ صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۶۱)

اسی طرز کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تیری رحمت کے بھروسے امجد
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۳۲)

حضرت امجد کی ان شوخیانہ رباعیات میں خدا اور بندہ کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو خالص عشقِ حقیقی پر مبنی ہے۔

طنزیہ انداز سے بھی آپ نے رباعیات کو دلچسپ بنادیا ہے۔ ان کی طنزیہ رباعیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ریاء اور تصنع سے سخت نفرت تھی۔ ایک جگہ

مصنوعی عبادت پر طنز کرتے ہوئے ''داغِ سجود'' کا حوالہ دیا ہے۔

پرداخت نہ کی تو نے کماہی دل کی
دیکھی نہ کبھی ذرا تباہی دل کی
اے زاہد خود بیں ! یہ نہیں داغِ سجود
پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

(پیامِ امجد، ص:۱۵۹)

ایک اور رباعی میں ریاکاروں کو کسی قدر سختی سے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

لے لے کے خدا کا نام چلاّتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۲۳)

حضرت امجد نے جھوٹے اور مکار مشایخوں کو جو بھولے بھالے انسانوں کو لوٹتے ہیں۔ انہیں اپنے طنز کا نشانہ یوں بنایا ہے۔

کس شان سے شیخ خودنما بیٹھا ہے
سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:۶۸)

انسان کی شیطانیت پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ایک کی تاک میں لگا رہتا ہے
خون ایک کا ایک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبثِ باطنی کے آگے
شیطان بھی لا حول ولا کہتا ہے

(ارمغانِ امجد ص: ۴۷)

حضرت امجد نے رباعیات میں مکالمانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ وہ خدا سے سوال کرتے ہیں اور خود ہی اس کا جواب بھی پیش کرتے ہیں۔ ایک رباعی میں وہ خدا سے سوال کرتے ہیں کہ وہ انسان سے قریب رہنے کے باوجود کیوں دور رہتا ہے۔

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں
باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک
کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں

(پیام امجد، ص: ۳۵)

اس کا جواب خدا سے یوں ملتا ہے۔ جس طرح دن کے وقت تارے تو آسمان پر ہوتے ہیں مگر سورج کی روشنی سے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ انسان کی بینائی کی کمزوری ہے کہ وہ دیکھ نہیں سکتے۔

بدلی چھائی ہوئی ہے برسات نہیں
تارے نکلے تو ہیں مگر رات نہیں

کچھ اس کا سبب بھی تو نے سمجھا امجدؔ
میں ہوں تیرے ساتھ تو میرے ساتھ نہیں

(پیامِ امجدؔ، ص: ۳۵)

اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کو مراقبہ کہا ہے۔ چونکہ اس میں معرفت کے مسئلوں کا حل ملتا ہے۔

ہر مرتبہ آئینہ دل دھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ دوم، ص: ۱۸)

رباعی کا چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے۔ شاعر پوری کوشش کرتا ہے کہ اس مصرعہ کو زوردار اور موثر بنائے۔ حضرت امجدؔ کی بیشتر رباعیوں کا چوتھا مصرعہ کمان کی تیر کی طرح نکلتا ہے اور دلوں میں جا کر پیوست ہو جاتا ہے۔

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تری رحمت کے بھروسے امجدؔ
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص: ۳۲)

''یوں ہی چلا آنے'' میں حضرت نے عاجز بندے کی نادانی کا اظہار کس والہانہ انداز سے کیا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اور رباعی:

ناحق پھر پھر کے سر پھرایا میں نے
اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے
طوفان میں ہے کشتی امید میری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۱۰)

چوتھے مصرعہ ''لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے'' میں جو اندازِ بیان ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک اور رباعی کے چوتھے مصرعہ میں لفظی الٹ پھیر سے بڑا کام لیا ہے۔

ہم صحبتِ بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۴۷)

لفظ نادان کے الٹ پھیر کے ذریعہ انسان فطرت کے ایک اہم پہلو کو پیش کیا ہے۔ حضرت امجد کے ہاں ایسی بیشتر رباعیاں ہیں جن کے چوتھے مصرعوں میں انہوں نے اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے۔

رباعیاتِ امجد کے حصہ دوم کے آخر میں ''معلومات'' کے عنوان سے بیس رباعیاں درج ہیں، جن کا ردیف ''معلوم نہیں'' ہے۔ ان تمام رباعیوں میں حضرت امجد نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کے علم حاصل یہی ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ حضرت امجد نے ان رباعیات میں اپنے مخصوص عارفانہ معلومات کا مظاہرہ اس انوکھے انداز سے کیا ہے، جس کی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند رباعیاں۔

کیا ہے تعبیر خواب معلوم نہیں
ناقص ہوں کہ کامیاب معلوم نہیں
کچھ دور سے لہریں تو نظر آتی ہیں
یہ آب ہے یا سراب معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص: ۹۷)

یہ کیا میرے روبرو ہے معلوم نہیں
میں کون ہوں کون تو ہے معلوم نہیں
ہوتی رہتی ہے دل ہی دل میں باتیں
کس سے یہ گفتگو ہے معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص: ۸۸)

کیوں گرم ہے آفتاب معلوم نہیں
کیوں ہے یہ انقلاب معلوم نہیں
جی بھر کے سوال کرلو جتنے چاہو
سب کا ہے یہی جواب معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم، ص: ۹۶)

بیکار ہوں یا با کار معلوم نہیں
نادان ہوں ہشیار ہوں معلوم نہیں
تقدیر بھی حق جزائے اعمال بھی حق
مجبور ہوں مختار ہوں معلوم نہیں

(رباعیات امجد حصہ دوم، ص: ۱۰۴)

غرض حضرت امجدؔ کا کلام تاثیر سے بھر پور ہے۔ ان کی رباعیات سادگی، سلاست، وروانی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اور کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک فطری اور باکمال شاعر ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔

رباعیاتِ امجدؔ کے موضوعات:

حضرت امجدؔ نے مختلف موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں۔ لیکن ان کا خاص موضوع تصوف ومعرفت رہا ہے۔ علاوہ ازیں رباعیاتِ امجدؔ میں اخلاق، فلسفہ، مذہب، وغیرہ زندگی کے مختلف موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ جس کا مختصر سا جائزہ ذیل میں لیا گیا ہے۔

متصوفانہ رباعیات:

مسائل تصوف پر حضرت امجدؔ کی نظر بڑی گہری تھی۔ انہوں نے تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے رباعی کی ہیت میں ادا کیا ہے، اور اپنی رباعیات میں مسائل، وحدت الوجود، ہمہ اوست، شاہد ومشہود، جبر واختیار، وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں۔

مسئلہ وحدت الوجود:

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو
[illegible]

اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے اکائی دیکھو

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۳۰)

مسئلہ ہمہ اوست:

واحب سے ظہور شکل امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست
گرداب، حباب، موج، سب پانی ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۲۹)

مسئلہ جبر و اختیار:

بے کار ہوں، باکار ہوں معلوم نہیں
نادان ہوں ہشیار ہوں معلوم نہیں
تقدیر بھی حق جزائے اعمال بھی حق
مجبور ہوں مختار ہوں معلوم نہیں

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص: ۱۰۲)

مسئلہ شاہد و مشہود:

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی

یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:٦٩)

اخلاقی رباعیات:

اخلاقیات صنفِ رباعی کا خاص موضوع رہا ہے۔ اردو رباعی میں اس موضوع پر جتنی رباعیاں کہی گئی ہیں کسی اور موضوع پر نہیں کہی گئی ہیں۔ حضرت امجد کے ہاں بھی اس موضوع پر رباعیوں کے بہترین نمونے ملتے ہیں' جن کے ذریعہ انہوں نے زندگی کی اعلیٰ قدروں کی اہمیت واضح کیا ہے۔ صبر وقناعت' عاجزی وانکساری' انسان دوستی وغیرہ جیسی تعلیمات سے انسان کی سیرت وکردار کی عظمت کو دکھایا ہے۔

صبر کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کچھ وقت سے ایک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ سوم، ص:٤٣)

حضرت امجد کے نزدیک کسی کا دل توڑنا گناہِ عظیم ہے۔ لکھتے ہیں:

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ متّصل کو توڑا

کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے

افسوس تو یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ سوم، ص: ۴۴)

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے علاوہ غیروں سے بھی ہمدردی سے پیش آئے اسی وقت ایک بہتر سماج کی تشکیل ہوسکتی ہے۔ حضرت امجدؔ نے اس تمثیل کے ذریعہ اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

ہمراہ کرم حسنِ عمل تلتا ہے

احسان سے بابِ معرفت کھلتا ہے

ہمدردئ غیر میں ہے اپنا بھی بھلا

کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

(گلستانِ امجدؔ، ص: ۳۵)

یہ اور اس طرح کی کئی رباعیات ہیں جن میں حضرت امجدؔ نے اخلاقیات کا درس دیا ہے۔

مذہبی رباعیات:

حضرت امجدؔ کی شاعری کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رباعیات قرآن وحدیث کی تشریح معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بیشتر رباعیاں کسی نہ کسی مذہبی نکتہ کی ترجمانی کرتی ہیں۔

'لا موجود الا اللہ' کے عنوان پر لکھی گئی یہ رباعی ملاحظہ ہو۔

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی

ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی

یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں بھی نہیں
ممکن نہیں دو جود تو بھی میں بھی

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص: ۶۹)

ایک اور رباعی میں خدا کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے قرآن شریف کی آیت ''وتعزُ من تشاء وتذل من تشاء'' کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں۔

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام بھی دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص:٦)

نماز کی اہمیت کو یوں واضح کرتے ہیں۔

دامانِ گناہ چاک ہو جاتا ہے
نفسِ سرکش ہلاک ہوجاتا ہے
مومن کے لئے عجیب نعمت ہے نماز
سرخاک پر رکھ کے پاک ہوجاتا ہے

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص: ۲۴)

حضرت امجد کے ہاں نعتیہ رباعیات بھی پائی جاتی ہیں۔ جو مذہبی رباعیات ہی کا ایک جزو ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک رباعی:

دریائے محبت ہے سفینہ میرا
ہے حسن کی خاتم یہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغِ عشق سے کعبۂ دل
معمور ہے نور سے مدینہ میرا

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص: ۳۵)

فلسفیانہ رباعیات:

فلسفہ بھی رباعی کا خاص موضوع رہا ہے۔ فارسی شعراء نے فلسفیانہ نکات کو پیش کرنے کے لئے اکثر اس صنف کا استعمال کیا ہے۔ حضرت امجد نے بھی اس موضوع پر رباعیات کہی ہیں۔ ذیل میں چند ایک مثالیں درج ہیں۔

عروج وزوال فطرت کا تقاضہ ہے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں۔

فطرت کا تقاضہ ہے کہ کوشش میں رہے
دلچسپی عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تودۂ خاک پھر رہا ہے دن رات
خاکی انسان کیوں گردش میں رہے

(امجد نمبر، ص: ٦٣)

گیس لہرا کے ناگ ہو جاتا ہے
نوحہ آخر میں راگ ہو جاتا ہے
ہر چند دیا سلائی ایک تنکا ہے
صرف ایک رگڑ سے آگ ہو جاتا ہے

دنیا کی ہر شئے اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔اس صداقت کی توثیق یوں کرتے ہیں۔

ساغر کی صفات جامِ جم میں دیکھو
آہن کا ہنر تیغ دو دم میں دیکھو
تقید ہے جامع کمالِ اطلاق
کیا حسن ہے سنگ میں صنم میں دیکھو

(رباعیات امجد حصہ دوم، ص: ۵۳)

حضرت علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی تلقین یوں کرتے ہیں۔

اے قطرۂ آب پھیل دریا ہو جا
اے طائر روح مرغ سدرہ ہوجا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر
اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

(ارمغان امجد، ص:۳۲)

مندرجہ بالا موضوعات کے علاوہ حضرت امجد نے زندگی کے کئی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

حضرت امجد نے ایک آدھ عشقیہ رباعی بھی لکھی ہے۔مثلاً

الفت میں عجب دردسری ہوتی ہے
دل جلتا ہے آنکھوں میں تری ہوتی ہے
فولاد سے سخت دل بھی پگھل جاتے ہیں
اچھی صورت بھی کیا بری ہوتی ہے

(گلستان امجد، ص:۱۰۳)

عشق کے علاوہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کی رباعیاں دیکھئے۔

غربت پر:

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں
مردود درِ جیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

(پیام امجد، ص:۱۰۹)

امیری پر:

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں
سر چڑھ کے زمین میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کا سامان
معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

(پیام امجد، ص:۱۱۰)

مئے پرستی:

پھر خود میں نہ آتے گر کبھی پی لیتے
ہر ساغر کی بچی کچی پی لیتے
کرتے کس منہ سے پھر مذمت مئے کی
اک مرتبہ کاش شیخ جی پی لیتے

(گلستان امجد، ص:۹۱)

غرض حضرت امجد کے پیش نظر مذہب ہو یا تصوف' فلسفہ ہو یا اخلاق ہر جگہ ان کے خیالات پر تصوف کا رنگ غالب ہے۔

اختتامیہ:

حضرت امجد کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا کلام حقائق سے لبریز اور فطرت کے قریب ہے ۔انہوں نے لفظی نمائش اور فرضی قافیہ پیمائی سے ہمیشہ اپنے آپ کو بچایا ہے۔اور اپنے سچے جذبات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے' جس سے ان کے قدرتی شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

حضرت امجد کا شمار چوٹی کی رباعی گوشعراء میں ہوتا ہے۔ان کی رباعیاں تاثیر سے لبریز ہیں ۔ سچی لگن اور خالص روحانی جذبات نے ان کے کلام کو دلکش بنا دیا ہے۔ نثر نما مصرعوں سے ان کی رباعیات میں بلا کی سلاست وروانی پائی جاتی ہے۔دقیق سے دقیق خیالات کو سلیس اور سادہ انداز میں پیش کرنا حضرت امجد کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔

تشبیہوں اور تمثیلوں کے استعمال سے آپ کی رباعیات عام فہم ہونے کے علاوہ موثر بھی ہیں ۔آپ نے شوخی وطنز کا پہلو اختیار کر کے کلام کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔ ان کے کلام میں لفظی ومعنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ غضب کی شعریت بھی موجود ہے۔

حضرت امجد نے رباعی کے پیرائے میں تصوف' مذہب' فلسفہ' اخلاق وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ان موضوعات کو عالمانہ' شاعرانہ' بلکہ عارفانہ انداز میں بیان کرنا حضرت امجد کے طرزِ بیان کی خصوصیت ہے۔انہوں نے اپنے کلام سے لوگوں پر دائمی اثر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ عوام کو انسانی فلاح وبہبودی کا رجحان اور انسان دوستی کے علاوہ خدا پرستی کا درس بھی دیا ہے۔

باب ششم

وِیما کی شاعری کے فنی محاسن

ویمنا کی شاعرانہ عظمت:

ویمنا کا نام علاقہ آندھرا کے بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے۔ اس عوامی شاعر کا کلام تقریباً تین ہزار پدوں پر مشتمل ہے۔ زبان کی سادگی چھوٹی چھوٹی بحروں' روز مرّہ اور محاروں اور ضرب الامثال کا بے تکلف استعمال اس کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ویمنا کی زبان میں عام بول چال کا اثر نمایاں ہے۔ اس کی زبان دقیق ہے اور نہ اس میں لفاظی ہے بلکہ اس کی شاعری سادگی اور روانی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کے بیشتر پد فلسفہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن پر طنزیہ رنگ غالب ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ویمنا کے پدوں کو عموماً احترام کے ساتھ پڑھے اور بطورِ حوالے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ویمنا کے کلام کو ادیبوں اور شاعروں نے عزت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ کیوں کہ اس نے قدیم ادبی روایتوں کو ٹھکرا کر عوام کی سادہ زبان اپنائی تھی۔ لفاظی اور تفریحی شاعری سے ہٹ کر سچّی اور اصلی شاعری کی تھی' اور عشقیہ اور مافوق الفطرت موضوعات سے پرہیز کر کے سماج' انسان اور اس کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں پر ویمنا کی شاعری کا گہرا اور دائمی اثر اب بھی پایا جاتا ہے۔

ویمنا نے سماج کی تہذیب اور انسان کی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لئے شہر شہر گھوم کر اپنی روحانی تعلیمات کی تلقین اپنے پدوں کے ذریعہ کی ہے۔ موضوعات کی سچّائی' خیال کی سادگی اور زبان کی روانی نے عوام پر ایسا اثر چھوڑا کہ اس کے پد انسان کی زندگی اور سماج کا ایک حصّہ بن گئے۔ ویمنا کے پد عوام کی زبان پر تو تھے ' مگر بکھرے ہوئے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ان پدوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کسی نے نہیں کی۔

ویمنا کے پدوں کو اکھٹا کرنے میں مغربی اسکالر سی۔ پی۔ براؤن اور تلگو ادیب

مدراس آئے تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران انہیں آندھرا ضلعوں میں ویمنا کے پدوں کو سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ ویمنا کے خیالات اور زبان کی سادگی سے وہ ایسے متاثر ہوئے کہ ویمنا کلام کو جمع کرنے کی کوشش میں جٹ گئے۔ چند پنڈتوں کی مدد سے ان کی چھان بین کروائی۔ براؤن نے بھی بذاتِ خود ویمنا کے مختلف پدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اور ۱۸۲۹ء میں بعنوان " The verses of vemana moral,Religious and satirical شائع کیا۔ براؤن کے بعد ویمنا کے پدوں کو اکھٹا کرنے میں پورنیا چاری کا نام آتا ہے۔ انہوں نے آندھرا کے مختلف علاقوں سے ویمنا کے پدوں کو ڈھونڈ نکالا اور ۱۹۱۲ء میں اپنی کتاب ''ویمنا یوگیندرا چرترمو'' میں شائع کیا۔

۱۹۴۰ء میں مدراس میں تلگو ادبیات کی نشاۃ ثانیہ کی پہلی دہائی منائی گئی۔ جس میں ویمنا کو بحیثیتِ شاعر اور فلسفی کے اجاگر کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید ادیبوں کی توجہ ویمنا کی طرف ہوئی اور اس پر مزید تحقیق کی جانے لگی۔ وقتاً فوقتاً ویمنا کے کلام کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ کے وی لکشمن راؤ، سری، آر. ریڈی، آر۔ اے. شرما، وی. سباراؤ، وی. آر۔ نارلا وغیرہ ادیبوں نے اس بڑے، انسان کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا۔

ویمنا کے تخیل کی بلندی شوخی، وطنزیہ انداز اور بے باکئ اظہار کی بنیاد پر ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی نے اپنی تلگو تصنیف kavitwa tatwa vicharamu میں ویمنا کو تلگو کا اعلٰی وسچا شاعر کہا ہے۔ جس کا خلاصہ نارلا نے یوں پیش کیا ہے۔

Dr.Reddy hailed vemana as one of the best and original poets produced by Andhra . Indeed , he said that for creative imagination, for wit and humour, for orginality and boldness of expression, and

expose pretentions, vemana was supreme in Telugu literature"(vemana -page-20).

ترجمہ:

''ڈاکٹر ریڈی کا کہنا ہے کہ ویمنا کا شمار آندھرا کے اعلی و اصلی شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تخلیقی فکر، پُرکاری و ہنرمندی، طنز و مزاح، اصلیت و بے باکی اظہار اور توہم پرستی کی مخالفت کی بنا پر تلگو ادب میں اسے اعلی درجہ کا مقام حاصل ہوا ہے۔''

(ویمنا،ص: ۲۰)

ویمنا نے اپنی زندگی کا پیشتر حصّہ قریوں میں گزارا تھا۔ دیہات کی آب و ہوا، فطری مناظر، جنگلات، باغات وغیرہ کا اثر اس کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ ویمنا نے اپنے جذبات، خیالات و تجربات کو ادا کرنے میں فطرت کا سہارا لیا ہے۔ بایں وجہ اسے شاعرِ فطرت قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر سی. آر. ریڈی نے اپنے انگریزی مضمون میں لکھا ہے۔

" By no means a laearned man, not at all a pandit, but a man of profound thought, of great reflective power and penetrating intution into life and its secular and spritual problems, his poetry is spring, pure and undefiled , entirely spontaneous and orginal in thought and style ——— all his similis and metaphors are drawn from the woods and fields , and rural scenes and atmosphere. He is both a poet of nature and natural poet "

(Radio talk-AIR- madras-1950)

ترجمہ:

''وہ (ویمنا) نہ پڑھا لکھا تھا اور نہ ہی پنڈت تھا۔ لیکن وہ ایک
گہری سوچ کا مالک تھا۔ جس نے اپنی وجدانی قوت سے زندگی،
لادینیت اور روحانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی
شاعری صاف وشفاف لہر ہے، جس میں کوئی گندگی نہیں۔ اس کی
فکر اور انداز سے بے ساختگی اور اصلیت ظاہر ہوتی ہے۔۔۔۔
اس کے تشبیہات واستعارات کا رشتہ کھیت، جنگلات، گاؤں کے
مناظر اور دیہی ماحول سے ہے۔ وہ شاعر فطرت کا ہونے کے
باوصف فطری شاعر بھی ہے۔''

فطرتاً ویمنا شاعرانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک شاعری ایک روحانی جذبہ ہے نہ کہ حصولِ دولت کا ذریعہ۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سچّا شاعر وہی ہے جو اس روحانی جذبہ کو لوگوں تک پہنچائے اور انہیں زندگی کے حقائق سے آگاہ کرائے۔ شاہی درباروں میں اس پاک جذبہ کو بیچنے والوں پر وہ سخت تنقید کرتا ہے۔ لکھتا ہے:

جو لوگ دال چاول کی خاطر
محض پیٹ پالنے کی خاطر
شاعری کرتے ہیں
وہ کیسے بڑے لوگ ہیں!

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۸۹)

ویمنا نے اپنی شاعری نہ راجاؤں سے داد پانے کے لئے کی، نہ پنڈتوں کو خوش کرنے کے لئے۔ روایتی انداز کو اپنایا اور نہ ہی عشقیہ اور مذہبی قصوں کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اس نے اپنے کلام کے ذریعہ ابدی حقیقت کو دریافت کرنے اور عوام میں اس کا

شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نیز سماج کے مختلف مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ موضوعات اس وقت تلگو ادب کے لئے نئے تھے۔ موضوعات کی بنا پر ویمؔا کو تلگو کا پہلا عوامی شاعر قرار دیتے ہوئے گوپیؔ نے لکھا ہے۔

" వేమన ఎన్నుకున్న వస్తువు చాతుర్వర్ణ వ్యవస్థ మీద ఖండన, ఆర్థిక అసమానతల
నిరాకరణ అమానుష విలువలన్నింటి మీద ధ్వజమెత్తడం.
ఇవన్నీ తెలుగు సాహిత్యంలో మొదటిసారిగా వేమన్నకు
కవితా వస్తువులునాయి (ప్రజాకవి వేమన - పేజి - 208)

ترجمہ:

’’ویمؔا نے اپنی شاعری میں نظامِ رنگ و ذات کی مخالفت کی ہے۔ اس نے اونچ نیچ کی تقسیم کو نہیں مانا اور توہم پرستی کی کھل کر تنقید کی ہے۔ یہ موضوعات تلگو ادب میں نئے تھے۔ اور ویمؔا ہی پہلا شاعر ہے جس نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے‘‘۔

(پرجاکوی ویمنا۔ صفحہ۔ ۲۰۸)

ویمؔا نے اس دور کی روایتی شاعری کو چھوڑ کر اصلی اور سچی شاعری کی، جس کا موضوع سماج تھا۔ اس طرح اس نے تلگو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر سی۔ آر۔ ریڈی کا کہنا ہے ’’ویما کی شاعری ایک نئے رجحان کی پیداوار ہے۔‘‘ اس قول کی تائید کرتے ہوئے نارلا، ویمؔا کو ایک کلاسکی شاعر قرار دیتا ہے:

" Dr. C.R. Reddy is much more correct when he states in his preface to this very book that Vemana is " a star of the first magnitude in our firmament "........he can he classical poet. His poetry has classical

finish ; his messaage has classical universality"

[vemana.page.47]

ترجمہ:

''ڈاکٹر سی ۔آر ۔ریڈی کا کہنا بالکل درست ہے ۔ وہ اپنی
کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ'' ویما ہمارے آسمان کا نیا
ستارہ ہے۔'' ۔۔۔۔اسے کلاسکی شاعر کہہ سکتے ہیں ۔اس کی
شاعری کی پہنچ کلاسکی ہے۔اوراس کی تعلیمات آفاقی ہیں۔''

(ویمنا،ص: ۴۷)

ویما تلگو زبان کا وہ مشہور شاعر ہے ، جسے خواص کے مقابلہ میں عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔شاعر چوڈپا ویما کی شہرت اور مقبولت کے تعلق سے ایک پد میں لکھتا ہے:

بارش میں نہ بھیگا ہوا، انسان
ویما کو نہ سنا ہوا انسان
ہر طرف تلاش کرنے سے
نہیں ملے گا۔اے شاعر چوڈاپا

(ویمنا پدیارتنا کرمو، دیباچہ)

یہ ویما کے کلام کی دلکشی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی شاعری کے ترجمے انگریزی، سنسکرت، تامل اور دیگر زبانوں میں کئے گئے۔

۱۸۲۹ء میں سی ۔ پی ۔ براؤن نے The verses of vemana Moral Religious and satirical" شائع کیا۔جس میں ویما کے ۲۸۰ پدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ۱۹۶۶ء میں میر محمود خاں نے ویما کے چند فلسفیانہ پدوں کا ترجمہ بعنوان The musings of mystics کیا ہے۔انگریزی ترجمہ ا ،م ،

یہ دو مجموعے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۲۶ء میں دورائی سوامی مودلی یار نے ویمؔا کے ایک ہزار پدوں کا تامل میں ترجمہ بعنوان ''ویمنا پدّی یم'' کیا تھا۔ جسے چنّے پوری کے بھارتی پریس نے شائع کیا تھا۔

۱۹۶۰ء میں سری رام نرسمہا مورتی شاعران نے ویمؔا کے تقریباً ایک ہزار پدوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا۔ اور اس مجموعہ کا نام '' ویمؔا گیتا '' رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ سنسکرت ہی میں ۱۹۷۳ء میں ''ویما ستکم '' شائع کیا گیا۔ جس کے مترجم راپلّی سری رام چندر مورتی ہیں۔ اس مجموعہ میں ویمؔا کے ۱۰۰ پدوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

تامل، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ ہندی اور اردو میں بھی ویمؔا کے ۲۲۳ پدوں کا ترجمہ آندھرا پردیش ساہتیا اکادمی کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔

ویمؔا کی شاعری کے فنی محاسن:

ویمؔا نے اپنا بیشتر کلام تلگو زبان کی مشہور شعری صنف آٹا ویلیدی میں لکھا ہے۔ آٹا ویلیدی کے علاوہ اس نے کنڈ تیٹ گیت، سی سم، دوی پد وغیرہ دیگر اصناف میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ مگر صنف آٹا ویلیدی اس کی شاعری کا امتیازِ خاص ہے۔

آٹا ویلیدی:

آٹا ویلیدی تلگو کی وہ صنف ہے جو قدیم دیہی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں ''لڑکی کا ناچ'' ۔ ویمؔا سے قبل کئی شاعروں نے اس صنف کو اپنایا مگر کسی نے اس بحر کو اتنا نہیں '' نچایا'' جتنا ویمؔا نے نچایا ہے۔ ویمؔا نے اس صنف میں کمال کی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس صنف میں ویمؔا کی شاعری اتنی مقبول ہوئی کہ وہ آٹا ویلیدی کی پہچان بن چکی ہے۔ نارلا کا خیال ہے کہ

ٹاویلیدی ویمؔا کی شاعری کی پہچان ہے۔لکھتا ہے۔

" The meter chosen by vemana for his poetry is
" ataveladi". It suits his genius admirably.........
It is a very old desi (indesgeneous) meter. Its
literal meaning is " a dancing damsel"........
hundreds of poets made use of it, but none
could make it " dance" exquistely as vemana.
what the mandakranta is to kalidasa, and the
sikharini to Bhavabhuti, what the kandam
is to Tikkana and the seesam to srinatha,
the ataveladi is to vemana.

[vemana .page.49]

ترجمہ:

’’ویمانے جس بحر کا انتخاب کیا ہے، وہ آٹا ویلیدی ہے۔ یہ بحر
اس کی ذہانت کو بڑھاوا دیتی ہے۔۔۔۔ یہ ایک قدیم دیسی بحر
ہے۔ اس کے اصطلاحی معنی ’’لڑکی کے ناچ‘‘ کے ہیں۔۔۔
سینکڑوں شاعروں نے اس بحر کو اپنایا۔مگر کسی نے اس بحر کو اتنا
نہیں نچایا جتنا ویمؔا نے نچایا ہے۔جس طرح مندکرانتا کی پہچان
کالی داسا سے، سیکھارینی کی بھوا بھوتی سے، کندم کی تکنا سے،
اور سیسم کی سری ناتھا سے ہے اسی طرح آٹا ویلیدی کی پہچان
ویمؔا کی شاعری سے ہوتی ہے۔‘‘

(ویمنا،ص: ۴۹)

آٹا ویلیدی چار سطروں والی چھوٹی سی نظم ہے۔ جس کی تعریف علمِ عروض

(چندس ساستر) میں یوں کی گئی ہے۔

ఇన గణత్రయంబు ఇంద్ర ద్వయంబును
హంస పంచ కంబు నీటవెలది.

(ఆంధ్రగీర్వాణి ఛందము : పేజి : 33)

یعنی آٹا ویلیدی اسے کہتے ہیں جس کی پہلی اور تیسری سطر میں سات سات رکن اور دوسری اور چوتھی سطروں میں پانچ پانچ رکن ہوتے ہیں۔ اس طرح آٹا ویلیدی میں کُل ملا کر چوبیس (۲۴) ارکان ہوتے ہیں۔

آٹا ویلیدی چار سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان چار سطروں میں شاعر اپنے خیال کو پوری طرح سے پیش کر دیتا ہے۔ پہلی دو سطروں میں وہ اپنے شعری تجربہ کی تمہید باندھتا ہے۔ اور تیسری سطر میں اس سے یا تو کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے، یا اس کے تعلق سے کوئی قولِ فیصل صادر کرتا ہے یا اس کی کوئی شاعرانہ دلیل دیتا ہے۔ یہ سطر آٹا ویلیدی کا حاصل ہے۔ اور اسے "درشٹانتا" کہتے ہیں۔ چوتھی سطر تخلص کے لئے مخصوص ہوتی ہے، جو تمام پدوں میں ایک ہی ہوتی ہے۔ اس سطر کو "مکٹ" کہتے ہیں۔ جیسے ویما کے پدوں کی چوتھی سطر "وسوادابھی راماونوراویما" ہے۔ اس سطر کے بغیر بات پوری ہو جاتی ہے۔ مگر نظم پوری نہیں ہوتی۔ جی۔ وی کرشناراؤ آٹا ویلیدی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

" Generally speaking vemana devotes the first two lines of his ataveladi to state the idea he wants to convey;to drive it home , he then given a brilliant analogy in the third. The fourth line is only an ornament, mukuta.It should be

evedent from this analysis that the whole beauty of the stage rests on his singular analogy or dristanta given in the third line .A good shot may occassionlly miss his mark. but not vemana his

analogy. His poetic skill and greatness depend, to a large extent,up on it.

[vemana-"His poetry and philosophy". page-49&50]

ترجمہ:

''یہ کہا جا سکتا ہے کہ ویمنا نے آٹا ویلیدی کی پہلی دو سطروں میں ایک خیال کو باندھا ہے۔ تیسری سطر میں اس کی بہترین مشابہت پیش کی ہے۔ چوتھی سطر صرف ایک گہنا ہے۔ جسے مکٹ کہتے ہیں۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پورے پد کی خوبصورتی کا انحصار تیسرے مصرعہ یا درشٹانتا پر ہوتا ہے۔ تیسرے مصرعہ کو پُر زور بنانے میں ویمنا بہت کم چوکتا ہے۔ اس کی شاعری کی خاصیت اور عظمت کا انحصار اسی تیسرے مصرعہ پر ہے۔''

ذیل میں ویمنا کا ایک پد (آٹا ویلیدی) اور اس کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ تا کہ اس کی اصل ہیت سے آگہی ہو سکے۔

تلگو:-

1. నిక్కమైన మంచి నీల మొక్కటి చాలు
2. తళుకు బెళుకు రాళ్ళు తట్టెడేల
3. చదువు పద్య మరియున్ చాలద యొకటి
4. విశ్వదాభిరామ వినురవేమ .

کافی ہے ایک اصلی نیلم

سو پتھر چمکیلے کس کام کے

پڑھنے کو ایک شعر ہے بہت!

سنو جی ویمؔا دھیان سے (ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۶۳۸)

شاعر نے پہلی دو سطروں میں خیال کی تمہید باندھی ہے۔ تیسری سطر میں قولِ فیصل صادر کیا ہے۔ جسے "درشٹانتا" کہتے ہیں۔ اور چوتھی سطر میں تخلص ہے جسے ''مکٹ'' کہا جاتا ہے۔

مُکٹ:

ویمؔا کے پدوں کی چوتھی سطر'' وسوادا بھی راما ونورا ویما'' ہے۔ مکٹ کے معنی ہیں '' تاج'' کے۔ جس طرح تاج ایک بادشاہ کی پہچان ہے۔ اسی طرح آٹا ویلیدی کی پہچان اس کی چوتھی سطر ہے، جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

ویمؔا کی چوتھی سطر کی تفہیم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ ویمؔا نے مُکٹ میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جس میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اور اس کے کئی معنی نکالے جاسکتے ہیں۔ براؤن نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں۔

" Listen , o vemana ! dear to the lord of all !"

(The verses of vemana — preface)

ترجمہ: خدا کے پیارے اے ویمؔا سن

وِدوان کرشنا مورتی نے اس سطر کا مفہوم یوں نکالا ہے:

" O vemana, the beloved of the Gods"

(Vemana satakamu - 1973)

ترجمہ: اے ویمنا، خداؤں کے پیارے

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ویمنا اس سطر میں ''وسوادا'' نامی دیوداسی اور ''ابھی راما'' نامی کسی سنار سے مخاطب ہے۔ کیوں کہ ویمنا کی زندگی کے تعلق سے جو معروف کہانی ہے اس میں دیوداسی اور سنار کا ذکر پایا جاتا ہے۔

وینکٹا سیشا کوی نے اس کا مطلب یوں پیش کیا ہے۔

''سن پیارے ویمنا جو سب کو دیتا ہے''

(بحوالہ پرجا کوی ویمنا ص: ۲۳۴)

اکثر تلگو ادیبوں کا ماننا ہے کہ ویمنا اس سطر میں خود سے مخاطب ہے۔ کیوں کہ یہ تلگو شاعری کی روایت ہے۔ اس طرح مکٹ کے مفہوم کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ ویمنا شاعر کے علاوہ ایک اعلیٰ انسان بھی تھا۔ اور یہ ایک اعلیٰ انسانی طریقہ ہے کہ دوسروں کو سمجھانے کے لئے خود کو مخاطب کرتے ہیں۔ تا کہ دوسروں کی دل آزاری نہ ہو۔ اور یہ ایک مشکل کام بھی ہے۔ اسلامی دنیا کے معروف مفکرّ مولانا وحید الدین خاں لکھتے ہیں:

''دوسروں کو مخاطب کرنا سب آسان کام ہے۔ اور اپنے آپ کو مخاطب کرنا سب سے مشکل۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہیں۔''

(الرسالۃ، نومبر، ۲۰۰۱، صفحہ: ۱۲)

شاید ویمنا نے بھی انسانیت کے پیام کو عام کرنے کے لئے چوتھی سطر میں خود سے مخاطب ہو کر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

عوامی زبان:

ویمناؔ نے شاعری میں عوامی زبان استعمال کی ہے۔اس کے مخاطب سیدھے سادے انسان تھے۔ پڑھے لکھے لوگ نہ تھے۔اس نے عام انسانوں سے مخاطب ہوکر اپنی تعلیمات کی تلقین کی ہے۔اس کی زبان منفرد ہے۔سادگی اور روانی اس کا خاصہ ہے۔اسی لئے اٹا دورائی نے اپنے ایک مضمون میں ویمناؔ کی شاعری کو بہتا ہوا پانی کہا ہے۔ویمناؔ نے اپنی شاعری میں وہ سادہ اور مختصر الفاظ استعمال کئے ہیں، جو سماج میں اکثر بولے جاتے تھے۔ویمناؔ کی زبان کے تعلق سے نارلا لکھتا ہے:

> "His (vemana's) language is chaste and crisp; his diction has limpidity and smoothness; his analogies always fresh and true , are like flashes of lightining which illumine the whole horizon
>
> (vemana .page.14)

ترجمہ:

> ''اس کی زبان صاف اور شستہ ہے۔اس کے الفاظ میں نرمی اور صفائی پائی جاتی ہے۔اس کے خیالات بالکل تازہ اور خالص ہیں، جن کی روشنی سے سارا افق چمک رہا ہے۔''

ایک اور جگہ ویمناؔ کو زبان کا استاد قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہے:

> " His poetic diction is unique. It is simple without being banal, sweet without being cloying . It has all the verve and variety of popular speech , of which as stated in the

first chapter he is the supreme master"

(vemana.page .48)

ترجمہ:

''اس کی زبان منفرد ہے۔ سادہ ہے۔ مگر معمول نہیں۔ شیریں
ہے مگر تکلفات سے عاری ہے۔ اس میں عام بول چال کی قوت
وتنوع موجود ہے۔ جن کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ زبان کا ماہر ہے
۔ جیسا کہ پہلے باب میں کہا گیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ویمنؔا کو اس وقت کی عوامی زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔

فارسی وعربی الفاظ کا استعمال:

ویمنؔا نے اپنی شاعری میں کہیں کہیں فارسی وعربی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی پوری شاعری میں کُل ملا کر سات یا آٹھ فارسی وعربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ان میں بعض الفاظ کو تلگو زبان کی ساخت کے مطابق بدلا گیا ہے۔ جیسے غلام کو گُلا مو؛ کافور کو کر پور؛ محل کو مالؤ؛ زنجیر کو جن جاری لو۔ انکے علاوہ عربی الفاظ یہ ہیں۔ اللہؔ محمدؐ اور مکہؔ۔

مسلمانوں کے حج کے سفر پر تنقید کرتے ہوئے ویمنؔا نے ایک ہی پد میں تین عربی الفاظ کا استعمال یوں کیا ہے۔

مکہ کی زیارت کر کے آنے سے
کیا تمہیں خدا مل گیا؟
کُل میں سمائے ہوئے ہیں
اللہ اور محمد، جو حق ہیں!

(ویمنا یدیا مولو، ص: ۱۶۷)

طنز ومزاح:

ویمؔا نے اپنے بیشتر پدوں میں طنزیہ انداز اپنایا ہے۔ طنز و مزاح اس کے وہ دو ہتیار ہیں، جن سے اس نے سماج کی برائیوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے طنزیہ پدوں کو گوپی نے شہد کی مکھیٔ سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

''شہد کی مکھی دیکھنے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر مٹھاس بھری ہوتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ایک ڈنک بھی ہوتی ہے جو چبھتی ہے۔''

(پرجاکوی ویمنؔا، ص:۲۰۸)

ویمؔا نے سماج کے ہر اس شعبہ پر طنز کیا ہے جس کی تعمیر کھوکھلے اصولوں پر کھڑی کی گئی تھی۔

ویمؔا کے عہد میں مذہب منافقانہ طرزِ عمل کا نام بن چکا تھا۔ برہمن، سادھو سنیاسی وغیرہ سب ظاہری ارکان کی ادائیگی میں محو تھے۔ ویمؔا نے اُن پر کھل کر طنز کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

یہ نہانا کیوں، یہ دان کیوں
دیوتاؤں کے آگے یہ پوجا کیوں
جب کہ تمہارے دل میں
کھوٹ ہی کھوٹ بھرا ہوا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۵۹)

نہ سر مونڈھنے سے، نہ لمبے بالوں سے
نہ راکھ ملنے سے، جپ کرنے سے

نہ آسن جمانے سے، نہ لباس سے

انسان میں آتی ہے بزرگی!

(ویمنا پدیارتا کرمو،ص:۳۴۷)

سنیاسی جو گھریلو زندگی کو ترک کر کے شہر شہر گھوم کر مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان کی جھوٹی اور ریاکارانہ زندگی پر طنز کرتے ہوئے ویمنا یہاں تک کہہ گزرتا ہے:

اپنے سر کے بالوں کو بڑھاتے ہیں

تمام جسم پر راکھ ملتے ہیں

لیکن سنیاسی اپنے گیروے لباس کو

طوائف کے لہنگے میں تبدیل کر دیتے ہیں

(ویمنا پدیارتا کرمو،ص: ۴۷)

جسم پر راکھ ملنے سے کیا حاصل

خدا پر دھیان لگانا ضروری ہے

کیا گدھا راکھ میں لوٹنے سے

مقدس بن جاتا ہے۔

(ویمنا پدیارتا کرمو،ص: ۴۳)

توہم پرستی انسان کی ایک بڑی خامی ہے۔ جس سے آدمی کے ذہن پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور وہ حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ اس خامی کو سماج سے دور کرنے کے لئے ویمنا نے اپنے کلام میں طنزیہ اندازِ بیان کو اپنایا ہے۔ لکھتا ہے:

اُلّو کے گھر میں آنے سے

گھر کو چھوڑ دیتے ہو

اُلّو اور گھر نے تمہارا کیا بگاڑا؟
تم جاہل و نالائق ہو

(ویمنا پد یارتنا کرمو،ص: ۱۳)

براہمن تاریخ اور وقت دیکھ کر
شادی کا مہورت طے کرتے ہیں
اگر وقت و تاریخ کی بات صحیح ہے
تو عورت کیسے بیوہ ہوگئی ؟

(ویمنا پد یارتنا کرمو،ص: ۱۶۵)

بت پرستی کی مخالف کا یہ انداز دیکھئے:

پہاڑوں سے پتھر لاتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہیں
اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں
کیسے بے وقوف ہیں یہ لوگ!

(ویمنا پد یارتنا کرمو،ص: ۱۵۱)

مندر کے باہر پتھر اور اندر پتھر
سیڑھی پتھر صنم بھی پتھر
مجھ کو ذرا بتلاؤ تم
کس کی پوجا بہتر!

ویمنا ان مردوں پر ٹوٹ پڑتا ہے جو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر پرائی عورتوں اور طوائفوں سے نا جائز تعلقات رکھتے ہیں۔ ویمنا کے درج ذیل پدیہ سے تلخی طنز کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسروں کی برتی ہوئی چیز کو استعمال کرنا

سب سے بدترین فعل ہے!

یہ دوسروں کے تھوکے ہوئے پان کو

دوبارہ چبانے کے برابر ہے!

(ویمنا پدیار تناکرمو،ص:۱۷۸)

اس دور کے بزدل اور کمزور حکمرانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتا ہے۔

اگر نالائق کو حکومت سونپ دی جائے

تو وہ لائق لوگوں کو بھگا دیتا ہے

چپل چبانے والے کتّے کو

گنّے کی مٹھاس کیا معلوم؟

(ویمنا پدیار تناکرمو،ص:۹۷)

بے وقوف حکمران کی خدمت

خواہ کتنے ہی سال کی جائے بے سود ہے

بانجھ گائے کی تھن کو مس کرنے سے

کیا دودھ نکل سکتا ہے ؟

(ویمنا پدیار تناکرمو،ص:۶۲۷)

ویمانے اپنی طنزیہ شاعری میں سماج کے ان افراد کو نشانہ بنایا ہے جو صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود بخالت سے کام لیتے ہیں۔ ان کی بخیلی اور کنجوسی کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتا ہے۔

اگر تم بخیل کو مارنا چاہو

تو اسے زہر دینے کی کیا ضرورت

چند پیسوں کی مدد مانگو

وہ خود مر جائے گا!

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۷۵)

ایک اور پد میں وہ بخیلی کو کسی قدر مبالغہ کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے۔

چیخ چیخ کے روتا ہے بخیل

گھر میں کسی کے مر جانے سے

پر اس کا دل یہی سوچتا رہتا ہے

کفن دفن کا خرچہ کیا ہوگا!

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۳۸۷)

یہاں تک ویمانے دیو مالائی قصوں کا بھی مذاق اڑایا ہے۔ وید اور پورانوں کی کہانیوں پر اعتراض کرتے ہوئے ویما کا یہ طنزیہ رنگ ملاحظہ ہو۔

رامائن کے ایک منظر پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ایک سونے کی ہرن کی خاطر سری رام

اپنی بیوی کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر

چلا جاتا ہے۔ یہ کیسا بھگوان ہے؟

جو نہیں جانتا سونے کی ہرن کا وجود نہیں ہے!

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۷۹)

ایک اور پد میں بھگوان کرشن کے مکھن چرانے کے فعل پر یوں طنز کرتا ہے:

دودھ کے سمندر کے مالک سری کرشن کو

مکھن چرانے کی کیا ضرورت؟

دوسروں کا مال کھانے میں

انسان کو بڑا لطف ملتا ہے!

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۱۲۷)

مہابھارت کی جنگ کے دوران ہوئی سازش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے

نام دھرم راج ہے، پر دھرم نہیں ہے

اپنے گرو کو اس نے،

دھوکہ سے مار دیا

نام اچھا رکھ لینے سے کیا فائدہ؟

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۲۲)

یہ اور اسی طرح کے کئی پدوں میں ویمنا کا طنزیہ و مزاحیہ انداز دیکھنے میں

آتا ہے۔ ویمنا کا یہ انداز صرف مزاح کے لئے ہی نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے بھی تھا، جس سے سماج کی تہذیب و تشکیل مقصود تھی۔

سوالیہ انداز:

ویمنا نے اپنے بیشتر پدوں میں سوالیہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہ وہ انداز ہے جس سے انسان کا ذہن متجسس ہوتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ ویمنا نے اپنے اکثر پدوں کی تیسری سطر میں سوالیہ انداز کو بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ یہ سطریں اتنی مقبول ہوئیں ہیں کہ یہ آج تلگو زبان کے محاورے اور ضرب الامثال بن چکی ہیں۔

ذیل میں اس کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

- کیا تم کتے کی دم پکڑ کر ندی پار کر سکتے ہو؟
- دودھ میں دھونے سے کیا کوئلا سفید ہوسکتا ہے؟
- کیا تم کتے کی ٹیڑھی دم کو سیدھی کر سکتے ہو؟
- کیا تم دیوار کو اُوپر سے نیچے کی طرف کھڑا سکتے ہو؟
- اُوپر اچھالی گئی گیند کیا اُوپر ہی رہ جائے گی؟
- کیا سونا تانبے جیسی آواز کر سکتا ہے؟
- کیا پہاڑ آئینہ میں چھوٹا نظر نہیں آتا؟
- کیا کتا گنگا میں ڈوبنے سے شیر بن جائے گا ؟
- مردوں کے کام کرنے سے کیا عورت مرد بن جائے گی؟

• ۔ کیا برگد کی بیج چھوٹی نہیں ہوتی ؟

• ۔ سر صاف ہیں، کیا تمہارے خیالات پاک ہیں؟

• ۔ بہتے پانی کے رُخ کو کیا کوئی موڑ سکتا ہے؟

• ۔ کچے مٹّی کے گھڑے میں کیا پانی ٹھہر سکتا ہے؟

• ۔ جو خود کو نہیں جانتا وہ خدا کو کیسے جانے گا ؟

• ۔ کیا جھوٹے طریقوں سے نجات مل سکتی ہے؟

• ۔ اگر کمان میں ڈھیل ہو تو کیا تیر چلائی جا سکتی ہے؟

• ۔ کیا شہد کی مکھی اپنا شہد دوسروں کو نہیں دیتی ؟

وغیرہ

(بحوالہ پرجا کوی ویمنا، ۲۳۶ تا ۲۳۹)

گریرسن ویمنا کے محاوروں کی مقبولیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" Vemana is today the most popular of all Telugu authors and there is hardly a proverb or pithy saying which is not attributed to him

[vemana .page.13]

ترجمہ:

[illegible]

بڑی مشکل سے کوئی ضرب المثل یا قول پایا جاتا ہے جس کا تعلق ویمنا سے نہ ہو۔

سوالیہ انداز میں لکھے گئے ان سطروں کے علاوہ بھی کئی ایسی سطریں ہیں جو قولِ فیصل معلوم ہوتی ہیں۔ وہ بھی بطورِ اقوال کے آندھرا کے لوگوں کی زبان پر پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں چند ایک کو پیش کیا جاتا ہے۔

- عورت کی چال صرف اسی کو معلوم!
- بچہ کی پیدائش صرف عورت کو معلوم!
- بُرے لوگوں کی بری موت یقینی ہے!
- وعدہ سے مکرنے سے جان دینا بہتر ہے!
- ذائقے الگ ہیں مگر بھوک ایک ہے!
- بخیل سے مدد مانگنا بیکار ہے!
- بیوی کے رشتہ دار قریبی رشتہ دار!
- ہاتھ میں مکھن گھی کو پریشان!
- انگلی کا پھوڑا انگوٹھی نہیں بن سکتا! وغیرہ۔۔۔

(بحوالہ پرجا کوی ویمنا، ص: ۲۳۶ تا ۲۳۹)

ویمنا کے منفرد اندازِ بیاں اور صنعتوں کے استعمال کی اہمیت اور مقبولیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر کرشنا مورتی اپنی کتاب "ویمنا ستکم" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

" The greatness of his style lies in the use of simple and un involved constructions,

and the placement of certain clauses of anticipatory investigations, all of which stand in contract to the style of classical poetry. These characteristics have made his verses a popular code of ethics and they have come to say as proverbial sayings in Telugu language"

[forward; vemana satakam]

ترجمہ:

''سادہ الفاظ ، چھوٹے چھوٹے فقرے ، علاقائی محاورے، علاقائی استعاروں کے علاوہ خیالات کی روشن اور پیشن گویوں نے ویمنا کے طرزِ بیان میں وہ خاصیت پیدا کردی ہے جس کا تقابل کلاسیکی شاعری سے کیا جاسکتا ہے۔ ان اوصاف کی وجہ سے اس کا کلام مقبولِ عام ہونے کے باوصف اخلاقیات کی منہ بولتی تصویر بھی ہے۔ اس کے اشعار تلگو زبان میں اقوالِ زرین ومحاورے کا مقام حاصل کرچکے ہیں۔''

صوفیانہ رنگِ اظہار:

ویمنا کے بعض پدوں میں ایسی سطریں استعمال ہوئی ہیں، جن کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ان میں جو کیفیات اور تجربات پیش کئے گئے ہیں وہ ایک یوگی یا صوفی کے عارفانہ تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ ان سطروں کا مفہوم سمجھنا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ مثلاً

- نیند کے آگے نیند

- علم کے پرے علم
- نظر میں چھپی نظر
- خلا کے اندر خلا
- اندھیرے کے آگے روشنی
- جسم میں چھپی روح
- روح میں چھپا جسم وغیرہ

یہ ایسے تجربات ہیں جو عام انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ویمنا کے ان عارفانہ تجربات کے تعلق سے نارلا لکھتا ہے:

" At places his poetry lacks clarity, but this happens only when he is dealing with highly mystical experiences. By their very nature , mystical experinces are personel;——All mystics,whether Hindu, christian or sufi , find it beyond their power of communicate to others the exact nature of mystical experiences without recourse to symbols . like other mystics vemana too uses his own symbols;"

[vemana , page - 48&49]

ترجمہ:

بعض [illegible]

> وقت ہوتا ہے جب وہ کسی عارفانہ تجربہ کو بیان کرتا ہے۔ ویسے بھی عارفانہ تجربات کی نوعیت انفرادی ہوتی ہے۔۔۔۔عارف، خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی یا پھر صوفی، بغیر علامتوں کا سہارا لیے ان تجربات کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر ہے۔ دیگر عارفوں کی طرح ویمانے بھی علامتوں کا استعمال کیا ہے۔''

ویما کی یہ زبان تصوف کی اصطلاحی زبان معلوم ہوتی ہے۔ جو خاص کر صوفیانہ محفلوں میں بولی جاتی ہے۔

الفاظ کی تکرار:

ویما کے بیشتر پدوں میں الفاظ کی تکرار پائی جاتی ہے۔ خیال میں زور اور نظم میں وزن پیدا کرنے کے لیے الفاظ کو دہرایا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے بات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

ذیل کی سطروں میں الفاظ کی تکرار ملاحظہ کریں:

- چکھنے اور مزید چکھنے سے ذائقہ بدل جاتا ہے
- گانے، اور مزید گانے سے راگ سنورتی ہے
- سننے، اور مزید سننے سے بات پر یقین ہوتا ہے
- کاسی، کاسی کر کے کیوں چلاتے ہو
- غور اور مزید غور کرنے سے خدا ملتا ہے
- چبانے اور مزید چبانے سے نیم بی مٹھا لگتا ہے وغیرہ

[illegible]

تشبیہات:

شاعر اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لئے دنیا کی چیزوں میں اس کے متبادل تلاش کرتا ہے۔تشبیہ اس ادبی کاوش کی ایک اہم صورت ہے۔ ویمآ ایک فطری شاعر ہے اور شاعرِ فطرت بھی (poet of nature and natural poet) اس نے اپنے جذبات کو پیش کرنے کے لئے فطرت کا سہارا لیا ہے۔ اور اس کی بیشتر تشبہات، مطالعہ فطرت کا نتیجہ ہیں۔

ویمآ اپنے ایک پد میں کم ظرف کو "تامبے" سے اور اعلیٰ ظرف کو ''سونے'' سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتا ہے:

کم ظرف چیختا ہے.

شائستگی سے بولے عالم

تامبا بجے زیادہ

سونا بجے ہے کم کم

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص: ۹۷)

ایک اور پد میں ویمآ نے نفس کو جڑ سے، جھوٹی زندگی کو شجر سے اور خواہشات کو ڈالیوں سے تشبیہ دی ہے۔لکھتا ہے۔

نفس کی جڑ کے کٹنے سے

جھوٹی زندگی کا شجر ٹوٹے گا

اور خواہشات کی ڈالیاں

سدا مرجائیں گی (ویمنا پدیار تنا کر مو،ص:۱۴۹)

اس طرح کی کئی تشبیہات کے استعمال سے ویمنا کی شاعری کے حسنِ اظہار اور حسنِ معنی میں اضافہ ہوا ہے۔

اختتامیہ:۔

ویمنا تلگو زبان کا سب سے مشہور و معروف عوامی شاعر ہے۔ جس کی شاعری آج بھی آندھرا کے لوگوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے۔ ویمنا کی شاعری سماج میں بکھری پڑی تھی۔ جسے براؤن اور پورنیا چاری نے کافی محنت سے اکھٹا کیا جو تقریباً تین ہزار پدوں پر مشتمل ہے۔ یہ ویمنا کی شاعری کی مقبولیت کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کی شاعری کے دیگر زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ ویمنا کو یہ شہرت بھی حاصل ہے کہ وہ تلگو کا تنہا شاعر ہے جس کی شاعری کے ترجمے ایک سے زیادہ زبانوں میں ہوئے ہیں۔

ویمنا نے اپنے پدوں میں جو شاعرانہ صنف اپنائی ہے ، اس کا نام ''آٹا ویلیدی'' ہے، جو چار سطروں پر مشتمل ہے۔ ویمنا نے اس صنف میں وہ مقبولیت حاصل کی کہ اب آٹا ویلیدی کی پہچان ویمنا کی شاعری بن چکی ہے۔ ویمنا کی آٹایلیدی کی چوتھی سطر (مکٹ) ''وسوادا بھی راما ونورا ویما'' کے معنی و مطلب کے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اکثر تلگو ادیبوں کا ماننا ہے کہ اس سطر میں ویمنا نے خود کو مخاطب کیا ہے۔

ویمنا نے اپنے کلام میں عوامی زبان اپنائی ہے۔ سادہ اور چھوٹے چھوٹے فقروں سے اس نے شاعری میں جو روانی پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایک طرف ویمنا کے پدوں کو انا دورائی نے بہتے ہوئے پانی سے تشبیہ دی ہے تو دوسری طرف نارلا نے اسے زبان کا استاد قرار دیا ہے۔ ویمنا نے کہیں کہیں فارسی و عربی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے

ویمآ نے اپنی شاعری میں سوالیہ وطنزیہ انداز اختیار کیا ہے۔ طنز ومزاح ویمآ کے وہ دو ہتیار ہیں جن کے ذریعہ وہ سماج اور انسان کی زندگی کی بے اعتدالیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اس کے پدوں کی کئی سطریں آندھرا میں زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ صوفیانہ انداز میں بھی اس نے کچھ پد کہے ہیں، جو عام انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ خیال میں زور پیدا کرنے کی خاطر کہیں کہیں ویمآ نے الفاظ کو دہرایا بھی ہے۔ تشبیہات کی ادائیگی میں ویمآ کا کمال فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس نے نادر وخوب صورت تشبیہات کے پھولوں سے اپنی شاعری کے چمن کو حسنِ جاوداں سے معمور کردیا ہے۔

بابِ ہفتم

امجدؔ حیدر آبادی اور ویمناؔ

کا

ادبی و فکری تقابلی مطالعہ

تقابلی مطالعہ میں اکثر اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جن ادیبوں یا شاعروں کا تقابل کیا جاتا ہے وہ یا تو ایک ہی زبان سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر وہ ہم عصر ہوتے ہیں۔ فائدہ اس مطالعہ کا یہ ہوتا ہے کہ دو شاعروں کے درمیان ان کے مراتب کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے تقابل میں کئی طرح کی مماثلتیں دیکھی جاتی ہیں۔ جیسے ان کی زبان یا ان کی قومی وتہذیبی روایات' یا ان کے عقائد وغیرہ وغیرہ۔ یہ کام قدرے آسانی سے انجام پاتا ہے۔ لیکن تقابل جب دو مختلف زبانوں کے فن کاروں کا کیا جائے تو ان کے متعلقہ ادبیات کی روایات اور ان کے پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ حضرتِ امجدؔ اور ویمناؔ کی شاعری اور ان کے افکار کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بطورِ خاص ملحوظ رکھی گئی ہے۔

حضرت امجدؔ اور ویمناؔ دو مختلف زبانوں کے شاعر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک سیاسی' سماجی' معاشرتی اور ادبی پس منظر الگ ہے۔ جس میں انہوں نے سانس لی ہے۔ اور جہاں ان کی شاعری اور فکر پروان چڑھی ہے۔ چناں چہ ان کے یہاں مشترکہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ متغائر پہلو بھی ملتے ہیں۔

حضرت امجدؔ اور ویمناؔ دو مختلف زبانوں کے شاعر ہونے کے باوصف ان کے فن اور موضوعاتِ شاعری میں کئی طرح کی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت امجدؔ نے اپنے کلام کے ذریعہ روحانی تعلیمات اور اخلاقیات کی تبلیغ کی ہے تو ویمناؔ نے بھی اپنی شاعری میں اعلیٰ انسانی اقدار، بہتر زندگی کی تشکیل اور خدا پرستی جیسے موضوعات پر زور دیا ہے۔

غرض ان دونوں شاعروں کے فکر وفن کا تفصیلی تقابلی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہم ان کے عہد اور حالاتِ زندگی کے ان مشترکہ پہلوؤں پر ایک نظر ڈالیں گے۔ جن کے زیر اثر ان کی شخصیت اور شاعری تشکیل پاتی ہے۔

حضرت امجدؔ ۱۸۸۶ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔موصوف نے اپنی پوری زندگی یہیں گذاری اور یہیں ۱۹۶۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔جبکہ ویمناؔ ۱۶۵۰ء سے ۱۷۵۰ء کے درمیانی دور کا شاعر تھا۔اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ آندھرا کے علاقہ رائل سیما میں گزارا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔اگرچہ ان دونوں شاعروں کے ادوار میں ۲۰۰ سے ۲۵۰ سال کا فرق ہے،مگر یہ دونوں شاعر موجودہ ریاستِ آندھراپردیش سے تعلق رکھتے تھے۔

تاریخی اعتبار سے حضرت امجدؔ اور ویمناؔ کا دور سیاسی انتشار کا شکار تھا۔عہدِ امجدؔ میں شہر حیدرآباد میں نظام شاہی حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔اور ہر طرف ایک افراتفری کا ماحول تھا۔۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ کے تباہ کن اثرات رونما ہو رہے تھے۔جس وقت ہندوستان بھر میں آزادی کے نعرے گونج رہے تھے،اس وقت تقسیم ہند کے بھی چرچے ہونے لگے تھے۔ریاستِ حیدرآباد کے تعلق سے بھی کئی طرح کی باتیں کہی جانے لگی تھیں۔کوئی اس ریاست کو ہندوستان میں ضم کرنا چاہتا تھا تو کوئی پاکستان میں،اور کوئی اسے علاحدہ ملک کی صورت میں دیکھنا چاہتا تھا۔اس پس منظر میں ہندوستان آزاد ہوتا ہے اور پاکستان کا قیام عمل میں آتا ہے۔تقسیمِ ہند کے بعد رونما ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات کا اثر ریاستِ حیدرآباد پر بھی پڑا۔لوگ افراتفری اور بے چینی کا شکار ہونے لگے۔حیدرآباد کا مستقبل بھی غیر یقینی ہو گیا تھا۔۱۹۴۸ء میں حکومتِ ہند کی جانب سے پولس ایکشن کیا گیا۔پولس ایکشن کے بعد ریاستِ حیدرآباد کو ہندوستان میں ضم کرلیا گیا۔

عہدِ ویمناؔ کے سیاسی حالات پر بھی اگر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ ویمناؔ (۱۶۵۰ـ۱۷۵۰ء) میں آندھراپردیش پر کسی کی حکومت مستقل طور پر قائم نہ رہ سکی تھی۔وجے نگر کی حکومت کا زوال ہو چکا تھا۔ٹھیکہ داروں علاقائی راجاؤں،نوابوں اور زمین داروں کے آپسی حملوں سے رعایا پریشان رہتی تھی۔ہر حکمران کو اپنی حکومت چھن جانے کا

ڈر لگا رہتا تھا۔ چناں چہ آندھرا، بالخصوص رائل سیما میں سیاسی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ ریاست اور رعایا دونوں سیاسی انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔

چناں چہ عہدِ امجدؔ اور عہد ویمناؔ کے سیاسی حالات پر نظر ڈالیں تو یہ مشترک پہلو سامنے آتا ہے کہ دونوں شاعروں کے ادوار سیاسی انتشار کے شکار ہو چکے تھے۔ عہدِ امجدؔ میں شہر حیدرآباد میں کئی طرح کی سیاسی تحریکیں اور تنظیمیں وجود میں آتی رہیں۔ مگر حضرت امجدؔ ایک صوفی منش ہونے کے ناتے انھوں نے کسی تحریک کی حمایت کی نہ مخالفت اور نہ ہی کسی تنظیم میں حصہ لیا۔ وہ اپنے کلام کے ذریعہ لوگوں کو روحانی تعلیمات کا درس دیتے رہے۔ جبکہ ویمناؔ ایک جوشیلا، اور جذباتی شاعر تھا۔ لہذا اس نے اپنے دور کے بدتر سیاسی وسماجی حالات اور اپنے عہد کے حکم رانوں اور امیروں کی کھل کر مذمت کی۔

ادبی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان دونوں شاعروں نے اپنے دور کے ادبی ماحول میں اپنی شاعری کی ایک الگ پہچان بنائی تھی۔ عہدِ امجدؔ میں اردو شاعری کے تین بڑے رنگ نظر آتے ہیں۔ ایک طرف قدیم طرز میں شعر کہنے کا رواج تھا۔ غزل ان کا اہم ذریعۂ اظہار تھا۔ ان کی غزلیں روایتی رنگِ تغزل سے پُر تھیں۔ معاملہ بندی، عاشقانہ جذبات، رنگین بیانی، ہجر و وصال کے قصّوں کے علاوہ عاشقانہ شوخی ان کی شاعری کے نمایاں پہلو تھے۔ یہ رنگ عوام وخواص دونوں میں مقبول تھا۔ دوسری طرف ترقی پسند ادب روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ نظم ان کا اہم ذریعہ اظہار تھا۔ اس میں سماج، سیاست اور زندگی جیسے اہم مسائل جلوہ گر ہونے لگے تھے۔ اور تیسری طرف دکنی شاعری بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ حیدرآباد کی مقامی زبان میں شعر کہنے کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کچھ شاعروں نے دکنی زبان میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس رنگ کی شاعری میں زیادہ تر طنز ومزاح کی چاشنی پائی جاتی تھی۔ اور شاعر بڑی بے تکلفی سے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل پر طنز کیا کرتے تھے۔ تاہم حضرت امجدؔ نے اپنی شاعری میں، جو طرز اپنایا تھا وہ ان

اسالیب شعری سے مختلف ہے۔ ان کے طرزِ سخن کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔ انھون نے نہ روایتی غزل کو اپنایا نہ ترقی پسند نظریہ شعر کی حمایت کی اور نہ ہی دکنی طرز کی شاعری کی۔ بلکہ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے خالص روحانی جذبات و کیفیات اور گہرے مشاہدات کو تصوف کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ نیز اخلاقیات، انسان دوستی وغیرہ موضوعات پر بھی قلم اٹھا کر ادب میں قابل احترام مقام حاصل کیا ہے۔

عہدِ ویمؔا میں تلگو کی روایتی شاعری تفریح کا ایک ذریعہ بن چکی تھی۔ وہ صرف درباروں اور پنڈتوں کی محفلوں تک محدود تھی۔ اس میں حقیقی زندگی کا کوئی دخل نہ تھا۔ شاعر عام طور پر مافوق الفطرت کہانیوں اور عشق و محبت کی رسمی باتوں کو ہی شاعری کا موضوع بنایا کرتے تھے۔ ایک طرف روایتی شاعری کا زور تھا تو دوسری طرف مذہبی شعراء عوامی زبان میں 'پد' کیرتن اور بھجنوں کے ذریعہ ہندو مذہب کا پرچار کرنے لگے تھے۔ اس پس منظر میں ویمؔا نے اپنی شاعری کی ایک خاص پہچان بنائی تھی جس کا موضوع سماج تھا۔ اس نے اپنی شاعری نہ درباریوں کے لئے لکھی نہ پنڈتوں کے لئے اور نہ ہی اس نے اپنی شاعری کا موضوع کسی مذہب کی تبلیغ کے لئے مختص کیا۔ ویمؔا نے اس دور کی روایتی 'لفاظی اور عشقیہ شاعری کو چھوڑ کر اصلی اور سچی شاعری کی، جسے تلگو ادب میں ایک نئے شعری دبستان ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

چنانچہ یہ دونوں شاعر اپنے اپنے دور کے ادبی رجحانات میں بہہ نہیں گئے۔ بلکہ انہوں نے اپنے مزاج اور طبیعت سے انصاف کیا اور اپنی شاعری کی ایک خاص پہچان بناتے ہوئے فطری و قدرتی شاعر ہونے کا ثبوت دیا۔

اب ہم اِن دونوں شاعروں کی زندگی کے اُن اہم واقعات و حادثات کا موازنہ کریں گے جو حضرت امجؔد کو ایک صوفی اور ویمؔا کو ایک یوگی بنانے میں

کارفرما ہوئے تھے۔

زندگی میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعات اور حادثات کا سامنا کرنے سے انسان میں چھپی ہوئی صلاحیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ جس سے اس کی شخصیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت امجدؔ کی مصیبتوں کا سلسلہ ان کی ولادت ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ آپ کو پیدا ہوئے محض چالیس دن ہی گذرے تھے کہ سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ اس وقت وہ اور انکی بیوہ ماں ایک دوسرے کا سہارا بن کر زندگی کے مسائل کا سامنا کرتے رہے۔ جب حضرت امجدؔ کی عمر ۲۲ سال کی تھی تو رودِ موسیٰ کی طغیانی کا حادثہ پیش آیا تھا۔ جس میں آپ کا سارا خاندان ماں بیوی اور بیٹی سب آپ کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آب ہوگئے تھے۔ اس حادثہ کا اثر آپ کے قلب وجگر پر ایسا ہوا کہ آپ عام زندگی کے معاملات سے الگ تھلگ ہوکر حق تعالٰی کی طرف متوجہ ہوگے۔ اور ایک درویش کی سی زندگی بسر کرنے لگے۔ چھ سال اسی حال میں رہنے کے بعد آپ کا دوسرا نکاح جمالِ سلمٰی سے ہوا۔ جن کی آمد سے آپ کی زندگی میں نورِ معرفت کی بارش ہونے لگی۔ جمالِ سلمٰی کے علمِ باطنی سے آپ بے حد متاثر ہوئے اور ان سے تاعمر فیض پاتے رہے۔ اس طرح حضرت امجدؔ کی زندگی کے یہ دو اہم واقعات ہیں جو آپ کی شخصیت کو نکھارنے میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

ویماؔ کی شاعری سے ماخوذ اس کی قیاسی زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نوعمر ہی سے ویماؔ کے لئے زندگی بوجھ بن چکی تھی۔ کم سنی ہی میں ماں کے مرجانے سے سوتیلی ماں کی سختیوں اور باپ کی لاپرواہی کو برداشت کرتا رہا۔ دیوداسیوں سے محبت کی مگر ان کی مطلب پرستی سے دل اچاٹ ہوگیا۔ بیوی کی بے وفائی دیکھی اور بچوں کی نالائقی سہی۔ زندگی سے بیزار ہوکر ویماؔ سکون وچین کی تلاش میں گھریلو زندگی کو چھوڑ چھاڑ کر حق کی جستجو میں نکل پڑا۔ پنڈتوں کی محفلوں میں جا بیٹھا مگر ان کا علم جھوٹا نکلا، مختلف مسلکوں کے یوگیوں

کی خدمت کی مگران میں اکثر ڈھونگی نکلے۔ ویما کی سچی لگن کو دیکھ کر شاید کسی یوگی نے اسے حقائقِ زندگی سے روشناس کرایا تھا۔ ویما نے زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور اچھے بُرے کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا تھا، اس لئے بہت جلد وہ اس فن سے آگاہ ہو گیا کہ کیسے اس بے معنی زندگی کو با معنی اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ اس وقت سے ویما کی حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

غرض حضرت امجد کی معلوم زندگی اور ویما کی قیاسی زندگی کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طغیانی رودِ موسیٰ کا حادثہ پیش آنے کے باوجود حضرت امجد نے دین و دنیا سے بغاوت نہیں کی، بلکہ صبر و تحمل کا دامن اختیار کرتے ہوئے حقائق زندگی کو سمجھنے کی جستجو میں لگ گئے۔ مصیبت کے بعد راحت کے مصداق یہ ہوا کہ آپ کو بعد میں بابرکت والی مسرت بھری زندگی نصیب ہوئی۔ اور ویما کی شاعری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی پھولوں کی راہ نہیں تھی بلکہ پُر خار وادی تھی۔ ہر جا خطرناک موڑ تھے۔ اس نے زندگی کی تلخ سے تلخ مشکلات کو جھیلا تھا۔ دنیا کے فریب کا شکار ہوا۔ مگر بعد ازاں ان مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ چناں چہ ان دونوں شاعروں نے حالات اور زمانے سے ہار نہیں مانی بلکہ نڈر ہو کر ان کا سامنا کیا۔ اور حضرت امجد بحیثیت صوفی شاعر اور ویما بحیثیتِ یوگی کے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو حقائق زندگی سے آگاہ کراتے رہے۔

حضرت امجد اور ویما کو جس صنفِ سخن پر مہارت حاصل تھی وہ چار مصرعوں یا چار سطروں والی مختصر نظم ہے۔

حضرت امجد نے خاص طور پر رباعی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ چار مصرعوں والے قطعات بھی بہت لکھے ہیں جو ان کی شاعری میں ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ ویما نے جس صنفِ سخن میں مقبولیت حاصل کی تھی وہ آٹا ویلیدی ہے اس میں بھی چار سطریں

ہوتی ہیں رباعی اور آٹا ویلیدی چار مصرعوں (یا سطروں) پر مشتمل ہونے کے باوجود ان دونوں اصناف میں تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ وہ یہ کہ آٹا ویلیدی پدوں کی چوتھی سطر تخلص کے لیے مختص ہوتی ہے، جو تمام پدوں میں دہرائی جاتی ہے۔ اس سطر کو ''مکٹ'' کہتے ہیں۔ مثلاً ویما کے پدوں کا مکٹ ''وسوادابھی راما ونوراویما'' ہے۔ اس سطر کے بغیر بھی شاعر کی بات پوری ہو جاتی ہے۔ مگر نظم پوری نہیں ہوتی۔ لہٰذا آٹا ویلیدی پدوں کی پہلی تین سطریں ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلی دو سطروں میں شاعر کسی خیال یا شعری تجربہ کی تمہید باندھتا ہے اور تیسری سطر میں اس سے یا تو کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے یا اس کے تعلق سے کوئی قولِ فیصل صادر کرتا ہے یا اس کی کوئی شاعرانہ دلیل دیتا ہے۔ یہ سطر آٹا ویلیدی کا حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ رباعی کے چاروں مصرعے اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ عموماً پہلے مصرعہ میں شاعر ایک خیال کو پیش کرتا ہے۔ اور بعد کے دو مصرعوں میں خیال کو بڑھا کر چوتھے مصرعہ میں انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ اس کی جان ہوتا ہے۔

رباعی اور آٹا ویلیدی اپنی سنجیدگی، حکیمانہ وصف اور نکتہ آفرینی کی وجہ سے شاعری میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان اصنافِ سخن میں سنجیدہ خیالات، مذہبی و اخلاقی مضامین، پند و نصائح، فلسفہ اور مضامینِ تصوف وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ ان میں محاکات اور جذبات نگاری سے بھی خوب کام لیا جاتا ہے۔ حضرت امجدؔ اور ویماؔ نے ادق سے ادق موضوعات کو سہل انداز میں پیش کر کے رباعی اور آٹا ویلیدی کو جو شرف بخشا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بایں وجہ حضرت امجدؔ کو اردو رباعی گوئی میں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اور تلگو کی صنفِ سخن آٹا ویلیدی میں ویماؔ کے ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے۔

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دل کے بہلانے کے لئے لفاظی یا قافیہ پیائی نہیں کی تھی۔ بلکہ اصلی سچی شاعری کی تھی۔ شاعری کے ذریعہ لوگوں کو حقائقِ زندگی سے آگاہ کرانا ان کا مقصدِ عین تھا۔

حضرت امجؔد خود یوں رقم طراز ہیں:

''نظم ہو یا نثر' تقریر ہو یا تحریر اس کا کچھ نہ کچھ حاصل ہونا چاہیئے، دینی یا دنیوی، خود اپنے لئے یا غیر کے لئے۔ جس نظم و نثر میں اس امر کا لحاظ نہ ہو اور محض قافیہ پیمائی اور خامہ فرسائی کی جائے بازیچۂ اطفال ہے۔ جس کی تعبیر مشقِ ابتدائی سے کی جاسکتی ہے کہ لکھا اور مٹا دیا۔''

(خرقۂ امجؔد، ص:۵)

حضرت امجؔد کا کلام انسانی زندگی کے حقائق کا مرقع ہے۔ جس کا ہر رنگ زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتا ہے۔ وہ ایک قدرتی شاعر تھے۔ لوگوں کی داد پانا ان کا مقصدِ شاعری نہیں تھا۔ بلکہ انسان کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آگاہ کرا کے اسے راہِ راست پر لانا چاہتے تھے۔ ایک رباعی میں لکھتے ہیں:

نغمہ کا ہے شوق لحن داؤد نہیں
اس طرز میں حمد کی محمود نہیں
سننے والے سے آہ بھی تو نکلے
اک واہ ہی شاعری کا مقصود نہیں

(رباعیاتِ امجؔد حصہ دوم، ص:۱۹)

ویؔما بھی ایک فطری شاعر تھا۔ اس کے نزدیک شاعری روحانی تجربات کے اظہار کا نام ہے' نہ حصولِ دولت کا ذریعہ ہے نہ حصولِ شہرت کا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سچا شاعر وہی ہے جو اپنے روحانی تجربات کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اور انہیں زندگی کے حقائق سے آگاہ کراتا ہے۔ لکھتا ہے:

جولوگ دال چاول کی خاطر

محض پیٹ بھرنے کی خاطر

شاعری کرتے ہیں

وہ کیسے بڑے لوگ ہیں!

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۸۹)

ایک اور جگہ شاعری کی اصلیت، اہمیت اور افادیت کو یوں بیان کرتا ہے

کافی ہے ایک سچا نیلم

پتھر چمکیلے کس کام کے

پڑھنے کو اک شعر بہت ہے

سنو جی ویما دھیان سے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۶۳۸)

اور

سو باتیں کرنا آسان ہے

ایک اچھا جملہ لکھنا مشکل ہے

اچھی تحریر عظمت کو بڑھاتی ہے

خراب تحریر ذلیل کرتی ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۱۲۸)

ویمآ کی شاعری سے بھی یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ اس نے اپنے خیالات لوگوں کے سامنے اس غرض سے پیش کئے تھے کہ وہ ان پر غور کریں اور حقائقِ زندگی سے آگاہ ہوکر زندگی کی قدروں کو سمجھیں اور بہتر زندگی کی تشکیل کریں۔

چناں چہ حضرت امجدؔ اور ویمآ کے پیشِ نظر انسانی فلاح و بہبودی کی اہمیت تھی انھوں نے اپنی زندگی کے کئی حادثوں کو عبرت ونصیحت کا ذریعہ بنایا اور لوگوں کے درمیان انسانی فلاح و بہبودی' ہمدردی، انسانیت کا پرچار کرنے کے علاوہ نظریہ توحید کی اشاعت کا کام کیا۔

حضرت امجدؔ اور ویمآ کی زبان سادہ و عام فہم ہے، جسے ہر ادنیٰ و اعلیٰ با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ انہوں نے کھلی لفاظی اور لفظی صنائع و بدائع وغیرہ سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے خالص جذبات و احساسات' تجربات و مشاہدات کو پوری صداقت کے ساتھ پیش کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ضمیر کی آواز کو سادہ لفظوں میں بلا تکلف ادا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بلا کی روانی' سلاست و صراحت پائی جاتی ہے۔

حضرت امجدؔ کے کلام کا یہ عالم ہے کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے۔ مشکل پسند مضامین کو بھی سہل انداز میں پیش کر کے انہوں نے سلاست کی عمدہ مثال چھوڑی ہے۔ مثلاً

افیوں ہو یا مٹھائی منہ میں رکھ لی
چیز اپنی ہو یا پرائی منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی
جو چیز ملی اٹھائی منہ میں رکھ لی

(رباعیات حصہ دوم، ص:۲۱)

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

(رباعیاتِ امجد حصہ اول، ص:۲۳)

ویمؔا بھی ایک قلندرانہ مزاج رکھنے والا عام فہم عوامی شاعر تھا۔اس نے بھی اپنے کلام میں چھوٹے چھوٹے فقروں، عوامی محاوروں اور ضرب الامثال وغیرہ کے استعمال سے وہ سادگی وروانی پیدا کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ویمؔا کو مغربی ومشرقی اسکالروں نے عوامی شاعر قرار دیا ہے۔اور تامل شاعرانادورائی نے اس کے پدوں کی سادگی وروانی کو بہتے ہوئے پانی سے تشبیہ دی ہے۔ویمؔا کے پدوں کی سادگی وروانی وہی محسوس کرسکتا ہے جو تلگو زبان سے واقف ہے۔ذیل کے پدوں میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اردو میں ویمؔا کی زبان کی سادگی وروانی کو پیش کرسکوں۔

کم ظرف چیختا ہے، چیخے سدا وہ لیکن
رکھے جو ظرفِ اعلیٰ بولے بڑے سکون سے
ویمؔا خدا کے پیارے سن لو ہمارا کہنا
سونے سے بھی زیادہ تامبا یہاں پہ کھنکے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۹۷)

ایک اور پد ملاحظہ ہو:

جو جسم میں بسا ہے، اس کو میں جانوں کیسے
یہ نفس ایک بندر، اس کو سنبھالوں کیسے

ویماؔ خدا کے پیارے، سن لو ہمارا کہنا

بندر کو اپنے من سے، آخر نکالوں کیسے

(ویمنا پد یار تنا کرمو، ص: ۲۳۸)

چناں چہ حضرت امجدؔ اور ویماؔ کا کلام پُر اثر ہونے کے باوصف نہایت سادہ سلیس و عام فہم ہے جسے ہر کس و ناکس بغیر کسی دقت کے سمجھ سکتا ہے۔ حضرت امجدؔ اور ویماؔ نے اپنی شاعری میں سادہ عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ تاہم جذبات و خیالات کی ادائیگی کے لئے انہوں نے جو لہجہ اختیار کیا ہے، وہ نسبتاً مختلف ہے۔ حضرت امجدؔ کی شاعری میں نرمی و دل آویزی پائی جاتی ہے۔ جبکہ ویماؔ نے اکثر تلخ و ترش لہجہ سے کام لیا ہے۔

حضرت امجدؔ کا کلام ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ وہ جیسے پاکیزہ صفت انسان تھے اسی طرح ان کا کلام بھی ہے۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ بڑا معصومانہ، والہانہ اور پیارا ہے۔ بایں وجہ ان کے کلام میں دلکشی، نرمی اور دل آویزی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ اپنی ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

کہو وہ بات جس میں ہو کرامات

سخن ہی حاصلِ دنیا و دیں ہے

نہ کیجئے سخت بات امجدؔ کسی سے

زباں میں دیکھو ہڈی نہیں ہے

(ریاض امجدؔ حصہ دوم، ص: ۸۵)

یعنی زبان نرم ہے۔ اس کا استعمال بھی نرم گوئی کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ سخت گوئی کے لئے۔ اس کے برعکس ویماؔ کے کلام میں شدت و تلخی پائی جاتی ہے۔ جو اس کے

مزاج کی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ فطرتاً بے باک و جذباتی انسان تھا۔ نیز اس زمانے کے گرے ہوئے سماجی حالات نے اس کے کلام اور اس کے مزاج دونوں میں تلخی اور ترشی پیدا کردی تھی۔ باوجود اس کے ویمّا نے آٹا ویلیدی پد کے آخری مصرعہ میں ''اے خدا کے پیارے ویمّا سن'' میں' خود کو مخاطب کرکے لہجہ کی کڑواہٹ کو دور کیا ہے۔

عورت کی کج ادائی و بیوفائی کو یہ دونوں شاعر کس طرح ادا کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے ویمّا لکھتا ہے۔

گھر کے پچھواڑے کی بیل کی
خبر گیری نہ کی جائے تو
وہ پھیل کر باہر نکل جاتی ہے
گھر کی عورت کا بھی یہی حال ہے

(ویمنا پد یار تنا کرمو، ص:۳۹۳)

حضرت امجد فرماتے ہیں۔

پردہ پوشی کو ایک چادر بس ہے
دن رات بسر کرنے کو اک گھر بس ہے
کیا مرد کو اک خدا نہیں ہے کافی
عورت کے لئے تو اک شوہر بس ہے

(میاں بیوی کی کہانی، ص:۱۲)

ایک اور جگہ ویمّا یوں لکھتا ہے:

بُری عورت بروں کو چاہتی ہے
سچے عاشق کی اسے پہچان نہیں
گوبر کھانے والے کیڑے کو
گڑ ھ کا مزہ کیا معلوم!

(ویمنا پد یار تنا کرمو، ص:۲۴۲)

حضرت امجدؔ کا انداز ملاحظہ ہو:

اپنے آقا سے کج ادائی توبہ
نا اہلوں کے در پہ جبہ سائی توبہ
غیروں سے تعلقات رب کے ہو کر
شوہر رکھ کر بھی آشنائی توبہ

(میاں بیوی کی کہانی، ص:۱۲)

ایسا نہیں کہ حضرت امجدؔ نے ہر جگہ نرمی سے کام لیا ہے اور ویما سختی سے۔ موضوع کے اعتبار سے کبھی کبھی حضرت امجدؔ نے بھی اپنے لہجہ میں سختی اختیار کی ہے۔ جھوٹے مشائخوں کی خودنمائی پر طنز کرنے کا لہجہ دیکھئے۔

کس شان سے شیخ خودنما بیٹھا ہے
سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں بایزید سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

(رباعیاتِ امجد۔ حصہ سوم، ص:۶۸)

جبکہ ویماؔ نے اسی خیال میں سوالیہ انداز اپنا کر لہجہ میں نرمی پیدا کر دی ہے۔
لکھتا ہے۔

جھوٹے یوگی عام لباس چھوڑ کر
گیروئے کپڑے پہن لیتے ہیں
اور اپنا سر منڈوا دیتے ہیں
سر صاف کرنے سے دل صاف نہیں ہوتا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۲۵۵)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ نے موضوع کا لحاظ کرتے ہوئے لہجہ میں نرمی و سختی اپنائی ہے۔ تاہم جب کبھی حضرت امجدؔ نرم لجہ اپناتے ہیں، جو ان کا فطری لہجہ ہے تو ان کے کلام میں جاذبیت و دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کہ ویماؔ تلخ و سخت لہجہ اختیار کرتا ہے تو اس کے کلام میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امجدؔ کی انفرادی خصوصیت ان کا صوفیانہ انداز ہے۔ جو ان کے پورے کلام میں ہر جگہ کسی نہ کسی طرح جلوہ گر ہے۔ جس طرح حضرت امجدؔ نے صوفیانہ انداز میں کئی رباعیات کہی ہیں اسی طرح ویماؔ نے بھی کئی ایسے پد کہے ہیں جن میں عارفانہ رنگ پایا جاتا ہے۔

خدا کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس عارفانہ خیال کو حضرت امجدؔ یوں بیان کرتے ہیں:

ہے شاہد حسن ہر نگہ پردے میں
ملتی نہیں کسی کو رہ پردے میں
اس کا ہر ایک راز کعبے کی طرح

پردے میں ہے اور وہ بھی سیاہ پردے میں

(رباعیاتِ امجد، حصۂ سوم، ص:۱۴)

ویما کا اندازِ بیان ملاحظہ ہو:

خدا ایک درخت کی طرح ہے

جس کی ڈالیاں ہیں نہ پتے ہیں

اس کی جڑ کا پتہ ہے نہ اونچائی کا

مگر پھل ہے امرت بھرا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص: ۳۳۵)

غرض حضرت امجد اور ویما نے اپنے کلام میں جو لہجہ اپنایا ہے وہ نسبتاً الگ ہے۔ جب کبھی انسان اور سماج کی خامیوں کا ذکر آتا ہے تو اکثر ویما نے سخت لہجہ اپنایا ہے۔ جبکہ حضرت امجد نے تلخ سے تلخ موضوع کو بھی نرم لہجہ میں ادا کیا ہے۔ تاہم جب خدا کی عظمت و بزرگی کا ذکر آتا ہے تو یہ دونوں شاعر عارفانہ انداز اختیار کرتے ہوئے لوگوں کو روحانی تعلیمات سے مسرور کردیتے ہیں۔

حضرت امجد اور ویما نے اپنی شاعری میں کثرت سے تمثیلی انداز بیان اپنایا ہے۔ ان کا منشا کچھ اور نہیں بلکہ لوگوں کو انسانیت کے زیور سے آراستہ کرانا ہے اور ان میں حقائق زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ کسی بات کو سمجھانے کا سب سے بہترین طریقہ تمثیل ہے۔ یہی وہ صنعت شعری ہے جس کے ذریعہ ادق سے ادق خیال کو بھی آسانی سے سمجھایا جاسکتا ہے۔

اصلاحی و اخلاقی نقطۂ نظر سے حضرت امجد اور ویما نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا

ہے اس کے ساتھ کما حقہ انصاف کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کا تمثیلی اندازِ بیان ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج ہیں۔ حضرت امجدؔ اور ویماؔ کا ایمان ایک خدا پر تھا۔ خدا کی وحدانیت کو سمجھانے کے لئے دونوں نے تمثیلی انداز اپنایا ہے۔ حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

انسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک
گو حرف کثیر ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالمِ کثرت کا ہے منشا واحد
اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص:۳۱)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

گائے کے رنگ الگ الگ مگر دودھ سفید
پھول مختلف ہیں مگر پوجا ایک
گو مذاہب جدا جدا ہیں
مگر منزل و خدا ہے ایک

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۲۲۲)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کا ماننا تھا کہ خدا انسان کے دل میں موجود ہے۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

سب کچھ اپنے میں جمع رکھ کر
دل، دل جمعی کو ڈھونڈتا ہے

بندہ ہے خدا کی جستجو میں
کپڑا روئی کو ڈھونڈتا ہے

(پیامِ امجد، ص:۵۸)

اور بقولِ ویما

جس طرح نمک پانی میں گھل جاتا ہے
اور کافور شعلہ بن جاتا ہے
اسی طرح خدا بھی
انسان کے دل میں سمایا ہوا ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۳۴۷)

بغیر اخلاص کے بڑے سے بڑا کام بھی کچھ معنی نہیں رکھتا۔ جب کہ اخلاص سے کیا ہوا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی قابلِ داد ہوتا ہے۔ اس خیال کی توضیح کرتے ہوئے حضرت امجد نے دیا سلائی اور ویما نے درخت کی بیج کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے۔

بقولِ حضرت امجد:

گیسو لہرا کے ناگ ہو جاتا ہے
نوحہ آخر میں راگ ہو جاتا ہے
ہر چند دیا سلائی اک تنکا ہے
صرف ایک رگڑ سے آگ ہو جاتا ہے

(رباعیات امجد، حصہ دوم، ص:۶۵)

اور بقول ویمؔا

اخلاص سے کیا ہوا کام کتنا ہی چھوٹا ہو
اس کا درجہ بلند ہی ہوتا ہے
بڑ کا درخت کتنا اونچا ہے
مگر اس کی بیج دیکھو کتنی چھوٹی ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۶)

نادان و جاہل انسان کی فطرت کسی حال میں بدل نہیں سکتی۔ حضرت امجؔد نے لفظی الٹ پھیر سے نادان کی نادانی کو ثابت کیا ہے تو ویمؔا نے جاہل کو کوئلہ سے تشبیہ دے کر اس کی جہالت کی دلیل دی ہے۔ حضرت امجؔد لکھتے ہیں۔

ہم صحبتِ بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

(رباعیات امجد حصہ اول ص:۴۷)

اور ویمؔا لکھتا ہے:

بے سمجھ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو
اس کی فطرت نہیں بدلتی
دودھ سے دھویا ہوا کوئلہ
کیا خاک سفید ہوگا؟

جس طرح نادان و جاہل کی فطرت بدل نہیں سکتی اسی طرح دانا و نیک ہر حال میں نیک ہوتے ہیں۔

بقولِ حضرت امجدؔ:

رہبر رہزن کبھی نہیں ہوسکتا
پانی روغن کبھی نہیں ہو سکتا
نادان کسی کا دوست ہو، ناممکن
دانا دشمن کبھی نہیں ہو سکتا

(گلستانِ امجد، ص:۲۱۵)

بقولِ ویماؔ:

نمک اور کافور لگتے ہیں یکساں
مگر ذائقہ دیکھو، ہوتا الگ ہے
اس طرح اک جیسے انسانوں میں
جو ہو بندۂ نیک، ہوتا الگ ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۵۴)

کم ظرف و اعلیٰ ظرف کی پہچان سے واقف کرانے کا تمثیلی انداز دیکھئے۔

حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

چاہے کچھ ہو اپنے غضب و شہوت سے
صاحبِ عقل کبھی زیر نہیں ہو سکتے

یہ تو کتوں کی صفت ہے کہ لڑے مرتے ہیں
بھونکنے والے کبھی شیر نہیں ہو سکتے

(گلستانِ امجدؔ، ص:۱۴۷)

اور ویمؔا لکھتا ہے:

نگا بڑے وقار سے بہتا ہے
گندہ نالہ شور کرتا ہوا دوڑتا ہے
جو حوصلہ اعلیٰ ظرف میں ہوتا ہے
وہ کم ظرف میں نہیں ہوتا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۱۰۴)

یہ اور اس طرح کے کئی اصلاحی و اخلاقی موضوعات کی ادائیگی میں حضرت امجدؔ اور ویمؔا نے تمثیلی انداز اپنایا ہے۔

تعلیمات:

حضرت امجدؔ اور ویمؔا کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ انسان کو انسان بنانا، اس کو حقائقِ زندگی سے آگاہ کرانا اور راور خدا پرستی کا درس دینا ان کے کلام کا نچوڑ ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اخلاقی سماجی، مذہبی، روحانی وغیرہ موضوعات کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس میں حضرت امجدؔ نے اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے خیال کی وضاحت کی ہے تو ویمؔا نے ہندو مذہب کے پس منظر میں اپنی بات پیش کی ہے۔ نیز ہندوستانی تہذیب وتمدن کا اثر بھی ان کے کلام پر خاصہ رہا ہے۔ ذیل میں حضرت امجدؔ اور ویمؔا کی تعلیمات کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی کثیر تعداد خدا کے ہونے پر یقین رکھتی ہے۔ان میں اکثریت کا ایمان ایک خدا پر ہے۔ازل سے ہر مذہب کے پیشواؤں نے اس بات کو اپنے مذہبی نقطۂ نظر سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔حضرت امجد اور رویمانے بھی اپنی شاعری میں خدا کی ذات کے متعلق مثلاً خدا کے وجود، وحدانیت اور اس کی پہچان وغیرہ جیسی روحانی تعلیمات کو اپنے مخصوص انداز میں سمجھانے کی کوشش ہے۔

یہ انسان کی بس کی بات نہیں ہے کہ وہ خدا کی ذات کو سمجھ سکے۔شروع سے اس موضوع پر انسان سوچتا آرہا ہے۔مگر آج بھی انسان خدا کی ذات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔حضرت امجد اور رویمانے بھی اس خیال کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے۔حضرت امجد فرماتے ہیں:

تجھ تک مرا وہم بھی نہیں جاسکتا
تجھ کو کوئی اور اک نہیں پاسکتا
اب تیرے تصور کی یہی صورت ہے
''اے وہ کہ تصور میں نہیں آسکتا''

(پیامِ امجد ص:۱۹)

اس دشت میں سینکڑوں کے جی چھوٹ گئے
پتھر بھی حباب کی طرح پھوٹ گئے
اس دام کا ایک عقدہ بھی کھل نہ سکا
بیجا کوشش میں بال و پر ٹوٹ گئے

(جمالِ امجد ،ص: ۱۳)

ہے شاہد حسن ہر جگہ پردے میں
ملتی نہیں کسی کو وہ پردے میں

اس کا ہر ایک راز کعبے کی طرح
پردے میں ہے۔اور وہ بھی سیاہ پردے میں

(رباعیات امجد حصہ سوم،ص: ۱۴)

اور ویما لکھتا ہے۔

جنی ہوئی شیرنی کو مار سکتے ہیں
دل کی گہرائیوں میں چھپے رازوں کو جان سکتے ہیں
مگر خدا کے قدرت کے کارخانہ کو

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۴۳)

نہ معلوم کیوں خالق نے
گھانس میں خوشبو پیدا کی
سونے نے اس کا کیا بگاڑا تھا
اس کے کرتوت بھی نرالے ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۸۶)

ایسا نہیں کہ خدا کی ذات کو بالکل ہی نہیں سمجھا جاسکتا۔خدا کی جستجو،اس کی مسلسل فکر اور کائنات کا بغور مطالعہ سے اس کو سمجھنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔حضرت امجد فرماتے ہیں:

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو
فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو

کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے
اِدھر دیکھو اُدھر کیا دیکھتے ہو

(رباعیاتِ امجد حصہ سوم ص: ۱۰۷)

لہریں کیا دیکھ رہے ہو دریا دیکھو
آئینہ دل میں روئے مولا دیکھو
اللہ اللہ کرتے ہوکیا دن رات
آنکھیں ہوں تو اسمِ مسمیٰ دیکھو

(رباعیاتِ امجد۔حصہ دوم ،ص:۴۵)

ہر قطرہ میں بحرِ معرفت مضمر ہے
ہر ایک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہوتو لعل بھی پتھر ہے

(رباعیاتِ امجد حصہ دوم،ص:۳۷)

اور ویّا لکھتا ہے۔

اے عارف عرفان کے محراب میں
اچھی سیرت کی بتی کا چراغ جلا
اور اس میں نیک اعمال کا تیل ہو
پھر اس کی روشنی دیکھ

(ویمنا پدیا رتنا کرمو،ص:۲۰۸)

بصیرت رکھنے والا حق کو سمجھ سکتا ہے
محنت کش ہی کام کی اصلیت کو جان سکتا ہے
پانی میں اترے بغیر
گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا

(ویمنا پدیار تنا کر مو،ص:٦٨)

طبیب سے دوا دارو کی جائے تو
بیماری دور ہو جاتی ہے
چراغ روشن کئے بغیر
اندھیرا کیسے دور کیا جا سکتا ؟

(ویمنا پدیار تنا کر مو،ص:٧٢)

خدا کی ذات کو سمجھنے کے لئے دل کی صفائی لازمی ہے۔ جب تک انسان اپنی کدورتوں ،پاک نہیں ہو جاتا تب تک وہ خدا کو محسوس نہیں کر سکتا۔ حضرت امجد فرماتے ہیں:

اس پھول کا رنگ اڑ جائے بو رہ جائے
سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات
میں اتنا مٹوں کہ صرف تو رہ جائے

(رباعیات امجد، حصہ دوم ،ص:۴)

تن کی ہستی کو چھو نہ کر دوں تو سہی
میدان ہوا کو ہونہ کر دوں تو سہی

ملتا نہیں تو مجھ سے اگر خیر نہ مل
میں بھی اس "میں" کو تو نہ کردوں تو سہی

(رباعیاتِ امجد، حصہ دوم ص:۴۱)

اور ویما لکھتا ہے:

جس طرح کیچڑ میں سورج کا عکس نہیں دکھائی دیتا
اسی طرح گندے دل والوں کو خدا کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی
شفاف پانی میں سورج کا عکس دکھائی دیتا ہے
نیک آدمی ہی خدا کو پہچان پاتا ہے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۵۷)

برہما کو فنا کر واسے وشنو میں ملا دو
وشنو کو فنا کر واسے شیو میں ملا دو
شیو کو فنا کر واسے خود میں ملا دو
خود کو بھی فنا کردو تبھی نجات ملے گی

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۴۱۱)

لوگ خدا کو پانے کی خاطر کوہ وصحرا میں جا بیٹھتے ہیں۔ حضرت امجد اور ویما کہتے ہیں کہ انسان اپنی دریافت ہی سے خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ اسے جنگل و بیابان کی خاک اڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت امجد فرماتے ہیں:

امجد ہر سمت یہ آنا جانا کیسا
جنگل جنگل یہ خاک اڑانا کیسا

کرتا ہے تو کس کی جستجو ، دیوانے
کھویا ہی نہ تھا اس کا پانا کیسا

(پیامِ امجد، ص:۵۹)

جسم سے قطع نظر کی تو کھلا روح کا راز
مجھے تنہائی میں بھی انجمن آرائی ہے
کوہ اور دشت میں پھرتا ہے کہاں اے امجد
بند کر آنکھ یہی گوشۂ تنہائی ہے

(رباعیات امجد حصہ دوم ،ص:۱۶۳)

ویما لکھتا ہے:

ندی کنارے یا جنگل میں یا پہاڑوں کے غاروں میں
خدا کی تلاش کیوں کرتے ہو
تمہارے من میں بسا ہے
کیا تم اسے نہیں دیکھتے !

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۳۵)

حضرت امجد اور ویما کا عقیدہ ہے کہ انسان جب تک اپنے آپ کو نہیں پہچانتا اس وقت تک وہ خدا کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ حضرت امجد فرماتے ہیں:

باقی نہ رہے گی میری خوبو مجھ میں
دیکھے گا نہ کوئی میرا پہلو مجھ میں

اک روز اٹھا ہی دوں گا میں کا پردہ
دیکھوں کیونکر چھپے گا پھر تو مجھ میں

(رباعیات امجد، حصہ سوم، ص:۱۶)

آنکھوں سے چھپے نگاہ سبحان اللہ
دل سے مخفی ہوا آہ سبحان اللہ
پردہ کیا اس نے مجھ سے مجھ میں چھپ کر
کیا آڑ بنائی واہ سبحان اللہ

(رباعیات امجد، حصہ دوم ص:۴۶)

ویما لکھتا ہے۔

خدا تمہارے اندر موجود ہے
پر لوگ اسے ظاہر میں ڈھونڈتے ہیں
ایسے بے وقوفوں کو سمجھانا
مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۱۵)

اے نادان! پتھر کی مورتی بنا کر
اسے اندھیرے میں رکھ کر پوجا مت کر
اس راز کو سمجھ کہ
تیرے ہی دل میں خدا موجود ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۸۳)

مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت امجد اور ویما کہتے ہیں کہ انسان خدا کا پرتو ہے

حضرت امجؔد لکھتے ہیں:

یہ فکر کسی دماغ سے نکلی ہے
یہ مۓ بھی کسی ایاغ سے نکلی ہے
تو نور ہی نور میں سراپا ظلمت
کالک بھی مگر چراغ سے نکلی ہے

(رباعیات امجؔد، حصہ سوم، ص:۴۶)

ممکن ہے قطرہ کا دریا ہونا
دریا کو تو آسان ہے قطرہ ہونا
بندے کا خدا ہونا بہت مشکل ہے
کچھ بات نہیں خدا کو بندہ ہونا

(جمال امجؔد، ص:۲۳۸)

گردون زمین وباغ وصحرا ہم ہیں
گرداب وحباب وموج ودریا ہم ہیں
دل میں ہے تخیلات کی ایک دنیا
ہم ہیں دنیا میں؟ یا دنیا ہم میں

(پیام امجؔد ص:۶۳)

اور ویما لکھتا ہے۔

خدا کسی دور دراز مقام پر نہیں
وہ ہر جگہ موجود ہے

جو خود کو پہچان لیتا ہے

وہی پرماتما ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۳۲۸)

ایک اور جگہ یوں لکھتا ہے:

انسان خود بھگوان ہے

اور وہ اس کی ہی عبادت کرتا ہے

کوئی جوگی ہتیلی میں ماکھن رکھ کر

گھی کی تلاش میں نکلتا ہے۔

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۵۷۹)

حضرت امجد اور ویما کا ایمان ایک خدا پر تھا۔ کائنات کی ہر شئے میں وہ خدا کی وحدانیت کو دیکھتے ہیں: حضرت امجد فرماتے ہیں:

انسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک

گو حرف کثیر ہیں مگر اسم ہے ایک

اس عالم کثرت کا ہے منشا واحد

اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

ہر رنگ میں بے رنگ کی وحدت دیکھی

پتھر میں بھی شعلہ کی لطافت دیکھی

واحد سے ہوا ہمیشہ واحد کا صدور

کونین میں وحدت ہی کی کثرت دیکھی

(رباعیات امجد، حصہ دوم، ص:۵۰)

اور ویما لکھتا ہے۔

گائے کے رنگ مختلف ہیں مگر دودھ سیفد

پھول مختلف ہیں مگر پوجا ایک

گو مذاہب کے راستہ الگ الگ ہیں

مگر منزل و خدا ایک ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۲۲)

زیورات الگ ہیں مگر سونا ایک

اجسام لگ ہیں مگر جان ہے ایک

ذائقے الگ ہیں مگر بھوک ہے ایک

روپ الگ ہیں مگر خدا ہے ایک

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۳۸۳)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کا ماننا تھا کہ یہ دنیا انسان کی اصل جگہ نہیں ہے۔ اس دنیا میں انسان کو مکمل خوشی نہیں مل سکتی۔ یہاں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہے۔ دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہوئے حضرت امجدؔ اور ویماؔ لکھتے ہیں۔

بقولِ حضرت امجدؔ

دنیا والو! ثبات دنیا میں نہیں
اک لحظہ قرارِ موجِ دریا میں نہیں
عالم کا وجود صورتِ لا سمجھو
لفظاً موجود ، اور معنی میں نہیں

(رباعیاتِ امجدؔ، حصہ اول، ص:۶۷)

اور بقولِ ویماؔ:

زندگی کی حقیقت کو پہچان کر
آدمی جان وتن کو ناچیز کیوں نہیں سمجھتا
اس سے منہ کیوں نہیں موڑتا
پانی کے بلبلے کا کیا بھروسہ

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۴۳۷)

ایک اور جگہ حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

ہے خون بھرا کٹورا یا لالہ ہے
ہے گوہر آبدار یا چھالہ ہے

دنیا کا وجود ہے وجودِ وہمی

یہ دائرہ شعلۂ جوالہ ہے

(رباعیات امجد، حصہ اول، ص:۴۳)

اور ویما لکھتا ہے:

اولاد، بیوی، بھائی اور ماں باپ

سب مایا ہے، خود انسان بھی مایا ہے

اور اس منحوس مایا کی حقیقت

ہمارے سمجھ کے باہر ہے

(ویمنا پدیا رتنا کر مو، ص:۲۳۶)

غرض حضرت امجد اور ویما کے نزدیک یہ دنیا اور زندگی وہم و مایا ہے۔

حضرت امجد اور ویما کو اپنے تہذیبی اور تمدنی حالات سے بخوبی واقفیت تھی۔ اور وہ سماج کے اعلیٰ و ادنیٰ لوگوں کی خوبیوں اور خامیوں کا علم بھی رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انسان اچھے اور برے کی تمیز کر کے بہتر زندگی کی تشکیل کرے۔ بایں وجہ آپ نے اپنے کلام میں روحانی تعلیمات کا درس دینے کے باوصف حقائق زندگی اور انسان میں پوشیدہ مثبت اور منفی قوتوں سے آگاہ کیا ہے۔ تا کہ انسان اپنی اور اپنی زندگی کی قدر و قیمت کو سمجھے اور سماج میں ایک بااخلاق زندگی بسر کرے۔

انسان کی صحیح پہچان اس کے اخلاق سے ہوتی ہے۔ انسان چاہے کتنا ہی دولت مند اور اونچے خاندان کا ہو اگر اس میں اچھے اخلاق نہیں پائے جاتے ہوں تو وہ ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اخلاق ہی ہیں جس کے ذریعہ انسان میں پوشیدہ قوتوں کا بہتر مظاہرہ ہوسکتا

ہے۔ اچھے اخلاق انسان کو انسان بنانے میں مدد کرتے ہیں۔ نیز خدا کو سمجھنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ اخلاق کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت امجدؔ اور ویماؔ لکھتے ہیں۔

بقولِ حضرتِ امجدؔ:

کوئی عالم ہو یا ولی زادہ
گر شرافت نہیں تو کیا حاصل
لاکھ ہو کوئی لکھپتی امجدؔ
جب قناعت نہیں تو کیا حاصل

(گلستانِ امجد، ص:۱۱۷)

جس کے سر میں ہو سرخود بینی
ایسے عارف سے تو غافل اچھا
علمِ اخلاق نہیں ہے جس میں
ایسے عالم سے تو جاہل اچھا

(گلستانِ امجد، ص:۲۳۲)

بقولِ ویماؔ

ذات گن وانوں کی کیوں پوچھیں
دولت خلق ہی بڑی دولت ہے
یہ جو دولت نہیں تو ساری دولت
کوڑی بھر کی نہ رکھے وقعت

(ویمنا یدمار تنا کرم، ص:۱۳۰)

با اخلاق عورت کی طرف
کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا
کردار اچھا نہ ہو تو عورت
ذلیل سمجھی جاتی ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۳۱)

ذات پات اور اونچ نیچ کا فرق حضرت امجدؔ اور ویماؔ کے نزدیک ہیچ ہے۔ ان کے ہاں خدا کی آگہی اور اخلاق ہی سب کچھ ہیں۔ اس خیال کو اپنے طرز میں ادا کرتے ہوئے حضرت امجدؔ فرماتے ہیں۔

تم شیخ بنو، مغل بنو، خان بنو
پہلے یہ ضرور ہے کہ انسان بنو
اسلام کی تبلیغ پہ کافر نے کہا
حضرت تم آپ تو مسلمان بنو

(ج امجدؔ، ص:۱۰۰)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

نہ کوئی دھیڑ ہے نہ چمار
سارے عالم کے انسان ایک ہیں
ان میں گوشت پوست ایک ہی ہے
انسان میں بسے خدا کی کوئی ذات پات نہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۱۶۶)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ مزید کہتے ہیں کہ آدمی کو سب سے پہلے انسان ہونے کا فرض ادا کرنا چاہئے ۔ ہمدردی ، آپسی میل ملاپ اور اور بھائی چارگی ہی سے انسان صحیح معنوں میں انسان ہونے کا شرف حاصل کرسکتا ہے ۔ انسانی برادری کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک انسان دوسرے کو اپنے جیسا محسوس نہ کرے ۔ انسان دوستی اور مساوات کی تبلیغ کرتے ہوئے حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تحمید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

(گلستان امجد،ص:۵۶)

میاں امجدؔ تمہاری جیسی مرضی
بنو کافر کہ اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں ایک کام کی بات
جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

(رباعیات امجدؔ حصہ سوم ص:۹۳)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

ذات پات کا جھگڑا لا حاصل
سب کے سب انسان ہیں
اونچ نیچ کا یہ فرق
محض بکواس ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۲۴۱)

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

دنیا کے تمام لوگوں کو
ایک ہی تھالی میں کھانا پروسو
بلا امتیاز مذہب وملت کے
آپس میں مل جل کر رہنے کی نصیحت کرو

(ویمنا پدیار تنا کر مو، ص:۷۷)

انسان کو یہ حق ہی نہیں کہ وہ کسی کے دل کو رنج پہنچائے۔ کیوں کہ انسان کے دل میں خدا بستا ہے۔ حضرت امجدؔ اور ویمنؔا کے نزدیک دل شکنی گناہِ عظیم ہے۔ دنیا کی ہر شئے ٹوٹ کر جڑ سکتی ہے۔ مگر ٹوٹا ہوا دل کبھی جڑ نہیں سکتا۔ اسی لئے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا
یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے
رونا یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

(رباعیاتِ امجدؔ۔ حصہ سوم، ص:۴۴)

تم گنج سے بھی رنج نہیں دھو سکتے
پلٹا ہوا رخ تو پھر نہیں مڑ سکتا
ضائع شدہ چیز پھر بھی مل سکتی ہے
ٹوٹا ہوا دل تو پھر نہیں جڑ سکتا

(پیامِ امجدؔ، ص:۱۱۹)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

لوہے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو

لوہار تپا کر جوڑ سکتا ہے

ٹوٹے ہوئے دل کو مگر

کوئی نہیں جوڑ سکتا

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۹۸)

دل کا لحاظ کرتے ہوئے اگر

گفتگو کریں تو تمہیں

ہر کوئی پسند کرتا ہے ورنہ

سب تمہارے مخالف ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۶۴۶)

انسان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ کوئی انسان ایسا نہیں جس میں کوئی بُرائی نہ ہو۔ دوسروں کو بُرا بھلا کہنے سے آدمی اپنی برائیوں کو پہچاننے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے صوفیوں اور یوگیوں کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ وہ کسی کی عیب جوئی کرتے ہیں نہ کسی کو برا کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت حضرت امجدؔ اور ویماؔ کے کلام میں ملتا ہے۔
حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

چشم بد سے ہر ایک کو دیکھیں

ہے یہی نقطۂ نظر اپنا

سب کمالات چھن گئے ہم سے
عیب جوئی ہے اب ہنر اپنا

(گلستان امجد، ص:۳۳)

ویما لکھتا ہے:

دوسروں کے عیب ڈھونڈنے والے بہت ہیں
انسان میں کوئی نہ کوئی عیب ہوتا ہی ہے
دوسروں کے عیبوں پر نظر رکھنے والے
خود اپنے عیب نہیں دیکھتے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۱۳۷)

ایک اور جگہ حضرت امجد لکھتے ہیں:

خیر و شر کا جب ایک مرکز ہے
حق سے باطل کو بھی جدا نہ کرو
چاہتے ہو بھلائی گر اپنی
تم کسی بد کو بھی برا نہ کہو

(گلستان امجد، ص:۷۳)

اور ویما لکھتا ہے۔

گردن زدن دشمن بھی اگر ہاتھ آجائے،
تو اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہئے
اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ بھلائی کر کر

چھوڑ دینا بہتر ہے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۱۳۴)

اخلاص کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے حضرت امجدؔ اور ویمناؔ کہتے ہیں کہ پاک دل ہی خدا کا گھر ہے۔ یعنی خلوص دل سے کی ہوئی عبادت ہی خدا کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔ جو لوگ صرف ظاہری ارکان کی ادائیگی کو عبادت سمجھتے ہیں ان پر طنز کرتے ہوئے حضرت امجدؔ فرماتے ہیں۔

پرداخت نہ کی تو نے کماہی دل کی
دیکھی نہ کبھی ذرا تباہی دل کی
اے زہد خودبیں ! یہ نہیں داغِ سجود
پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

(پیامِ امجدؔ، ص:۱۵۹)

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

(رباعیات امجدؔ۔ حصہ اول، ص:۲۳)

ویمناؔ کہتا ہے۔

ضمیر اگر پاک نہیں تو مذہبی رسومات سے کیا حاصل

اگر [illegible]

جب دل ہی صاف نہیں تو

بھگوان شیو کی پوجا کیوں؟

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۲۹)

یہ نہانا کیوں؟ یہ دان کیوں؟

دیوتاؤں کے آگے یہ پوجا کیوں؟

جب کہ تمہارے دل میں

کھوٹ ہی کھوٹ بھرا ہو

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۴۵۹)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ اپنے اس خیال کو واضح کر دیتے ہیں کہ جب تک انسان کے دل میں میل اور کدورت باقی ہے وہ چاہے کتنی ہی عبادت کرے بیکار ہے۔ اخلاص سے کی ہوئی تھوڑی سی عبادت بھی قابل قدر ہے۔

حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی

طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی

اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو

حضرت! تم سے تو دیا سلائی اچھی

(رباعیات امجدؔ، حصہ سوم، ص:۴۴)

ویما کہتا ہے:

پاک دل سے کیا ہوا نیک کام کتنا ہی چھوٹا ہو
اس کا درجہ بلند ہی ہوتا ہے
بڑ کا جھاڑ کتنا اونچا ہے
پر اس کی بیج دیکھو چھوٹی ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۵۶)

جو لوگ ظاہر پرستی اور تو ہم پرستی کو بڑھاوا دیتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں، ان حضرات کی حضرت امجد اور ویما نے کھل کر مخالفت کی ہے۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان رسم پرستی اور تو ہم پرستی کے جال میں پھنس کر اسی کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ اور سچی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جھوٹے مشائخ اور ڈھونگی سادھوؤں پر طنز کرتے ہوئے حضرت امجد لکھتے ہیں:

کس شان سے شیخ خود نما بیٹھا ہے
سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں بایزید اور سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

(رباعیات امجد حصہ سوم ص:۶۸)

درگا ہوں پر رکوع و سجدہ دیکھا
قبروں کا نشان عرش سے اونچا دیکھا
مردہ درِ دستِ زندہ سنتے تھے مگر
زندوں کو بھی بدستِ مردہ دیکھا

(رباعیات امجد، سوم ص:۷۵)

اور ویما لکھتا ہے: -

مالا پھرانے سے، دکھاوے کی پوجا کرنے سے کیا حاصل
جب کہ دل میں کھوٹ بھرا ہو
ایسے لوگ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں
انہیں نجات کا راستہ نہیں ملتا

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۳۰۴)

نادان برہمن شادی کے لئے
کوئی نہ کوئی مہورت مقرر کرتا ہے
جب مہورت ٹھیک ہے تو
عورت کیسے بیوہ ہوگئ

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۲۱۴)

ڈھونگی سادھو اور جھوٹے مشائخ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں ۔ مگر ان کے برخلاف سچے رہنما یا استاد یا گرو انسان کو راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرتے ہیں ۔ نیک رہنما کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت امجد لکھتے ہیں:

جو تم سے جوڑے تم اس سے جوڑو
جو تم سے توڑے تم اس سے توڑو
لیکن ہو جس سے اصلاح اپنی
اس کا دامن ہرگز نہ چھوڑو

(گلستانِ امجد، ص:۲۳۵)

بقولِ ویما:

دودھ میں مل کر پانی دودھ بن جاتا ہے
اچھے گرو (استاد) کی سنگت میں
انسان عالم و دانا بن جاتا ہے
نیک لوگوں کی صحبت کا یہی نتیجہ ہے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۵۵)

جس طرح حضرت امجد اور ویما نے سچے رہنما اور جھوٹے رہنما سے ہونے والے نفع و نقصان کو بتایا ہے۔ اسی طرح نیکوکار و بدکار، کم ظرف و اعلیٰ ظرف، عالم و جاہل کے اوصاف بھی گنوائے ہیں۔ ان کا یقین تھا کہ انسان کی فطرت بدل نہیں سکتی۔ اگر انسان فطرتاً اچھے اوصاف کا مالک ہے تو وہ کسی بھی حالت میں برا کام نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی اپنے اندر بری خصلتیں رکھتا ہو وہ چاہے کتنا ہی اچھوں میں رہے اس کی فطرت بدل نہیں سکتی۔ نیکوکار اور بدکار کی صفتوں کو بیان کرتے ہوئے حضرت امجد لکھتے ہیں:

نیکو کی ملاقات ہی سرمایۂ عمر ہے
جو جوہرِ روح کو جلا دیتی ہے

اور صحبت بد کو سمِ قاتل سمجھو
راکھ آگ کو بھی راکھ بنا دیتی ہے

(گلستانِ امجد، ص:۲۴۳)

صحبت میں نیکو کاروں کی بدخو نہ گئی
فطرت کی برائی یک سرمو نہ گئی
مچھلی کی تمام عمر پانی میں کٹی
لیکن اس پر بھی اسکی بد بو نہ گئی

(پیامِ امجد،ص:۷)

اور دیما لکھتا ہے:

نیک لوگوں کے بول سارے
کوئل کی کوک جیسے ہوتے ہیں
کوّے کی کائیں کائیں کی مانند
بول اصحاب بد کے ہوتے ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۶۵)

بیج ہی سے شجر ببول کا
ہوتا ہے خاردار سارا
آدمی جو برا بفطرت سے
تادمِ آخر، رہے ٹیڑھا

نیکوکار اور بدکار کے فرق کو واضح کرنے کے لئے حضرت امجد اور ویما نے مختلف تشبیہوں اور تمثیلوں کا استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اچھے اور برے انسان دیکھنے میں تو ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی اصل فطرت تب معلوم ہوتی ہے جب انہیں قریب سے پرکھا جاتا ہے۔

حضرت امجد فرماتے ہیں:

رہبر رہزن کبھی نہیں ہوسکتا
پانی روغن کبھی نہیں ہوسکتا
نادان کسی کا دوست ہونا ممکن
دانا دشمن کبھی نہیں ہوسکتا

(گلستان امجد، ص:۲۱۵)

اور ویما لکھتا ہے:

نمک اور کافور لگتے ہیں یکساں
مگر ان کا ذائقہ دیکھو ہوتا الگ ہے
اسی طرح اک جیسے انسانوں میں
جو ہو بندۂ نیک، ہوتا الگ ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۴)

کم ظرف و اعلیٰ ظرف کی پہچان کو دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کم ظرف ہر چھوٹی

اس بات کو سمجھاتے ہوئے کم ظرف کو حضرت امجدؔ نے کبھی حباب سے تشبیہ دی ہے تو کبھی کتوں سے، اور ویماؔ نے کبھی تامبا کہا ہے تو کبھی شور کرتا ہوا نالہ کا پانی۔ اسی طرح اعلیٰ ظرف کو حضرت امجدؔ نے شیر کہا ہے اور ویماؔ نے سونے اور گنگا کے مقدس پانی سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر و خسیس
تنکہ تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

(رباعیات امجد، اول، ص:۴۴)

چاہے کچھ ہو مگر اپنے غضب و شہوت سے
صاحبِ عقل کبھی زیر نہیں ہو سکتے
یہ تو کتوں کی صفت ہے کہ مرے پڑتے ہیں
بھونکنے والے کبھی شیر نہیں ہو سکتے

(گلستانِ امجدؔ، ص:۱۲۷)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

کم ظرف چیختا ہے، چیخے سدا وہ لیکن
رکھے جو ظرف اعلیٰ بولے بڑے سکون سے
ویماؔ خدا کے پیارے سن لو ہمارا کہنا
سونے سے بھی زیادہ تامبا یہاں پہ کھنکے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۹۷)

گنگا بڑے وقار سے بہتا ہے
گندہ نالہ شور کرتا ہوا' ڈورتا ہے
جو حوصلہ اعلی ظرف میں ہوتا ہے
وہ کم ظرف میں نہیں ہوتا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۱۰۴)

عالم و جاہل کا فرق دکھاتے ہوئے حضرت امجد لکھتے ہیں:

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا تو نادان رہا

(رباعیاتِ امجد حصہ اول، ص:۴۷)

اور ویما لکھتا ہے:

بے سمجھ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو
اس کی خصلت نہیں بدلتی
دودھ سے دھویا ہوا کوئلہ
کیا خاک سفید ہوگا

ایک اور جگہ حضرت امجؔد لکھتے ہیں:

صحبتِ نیک سے جاہل فطرت
جاہلیت کو نہیں کھوسکتی
آگ ہی راکھ بنے تو بن جائے
راکھ تو آگ نہیں ہو سکتی

(پیامِ امجؔد، ص:۷)

اور ویمؔا لکھتا ہے:

سال بھر دھونے پر بھی
چوہے کا چمڑا کالا ہی رہے گا
لکڑی کی گڑیا کو پیٹنے سے
کیا وہ بول سکے گی؟

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۸)

غربت وامارت کی حقیقت پر بھی حضرت امجؔد اور ویمؔا نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے فوائد ونقصانات سے وہ بخوبی واقف تھے۔ دولت مگر حد سے بڑھ جائے تو وہ مصیبت بن جاتی ہے اور مفلسی انسان کو غارت کردیتی ہے۔ پیسہ وہ سماجی قوت ہے جسے ہر انسان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دولت مندی دنیا کی نظر میں اعزازی درجہ رکھتی ہے۔ حضرت امجؔد اور ویمؔا نے سماج میں پیسہ کی اہمیت کو یوں بیان کیا ہے۔

بقولِ حضرت امجؔد:

روغن کے سوا چراغ کب جلتا ہے
پانی کے بغیر نخل کب پھلتا ہے

ہر جا زر و سیم کا اثر ہے امجدؔ
کھل جا سم سم سے کام کب ہوتا ہے

(ریاضِ امجدؔ، ص:۱۲۴)

بقولِ ویماؔ:

انسان کتنا ہی دانش مند ہو
اور اپنے علم وفن پر فخر کرتا ہو
خواہ وہ بڑی باتیں کرتا ہو
وہ دولت مند کا غلام ہے

(ویمنا پدیار تناکرمو، ص:۶۵۲)

بقول حضرت امجدؔ:

عاشق کی ہوس کہ دل رُبا مل جائے
عارف کی تمنا کہ خدا مل جائے
ہم اپنے بھی دل کی بات کہہ دیتے ہیں
وہ یہ کہ کہیں سے روپیہ مل جائے

(رباعیات امجدؔ، سوم، ص:۸۰)

بقولِ ویماؔ:

تاجر چاہتا ہے کہ قحط پڑے
حکیم چاہتا ہے کہ امراض پھیلے

غریب چاہتا ہے کہ اس کی رسائی
دولت مند کے یہاں ہو جائے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۸۱)

دولت جب حد سے زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ انسان پر سوار ہو کر حکومت کرنے لگتی ہے۔ انسان دولت کے نشہ میں چور ہو کر انسانیت کو بھول جاتا ہے۔ اور اس میں غرور و تکبر جیسے منفی جذبات بڑھ کر اسے بے چین کر دیتے ہیں۔ حضرت امجد لکھتے ہیں:

دولت سے کبھی نصیب راحت نہ ہوئی
زر کی کثرت سے کم مصیبت نہ ہوئی
ہم مر بھی گئے طبیب بیٹھے ہی رہے
کچھ عقل سے جان کی حفاظت نہ ہوئی

(پیامِ امجد، ص:۱۸۲)

اور ویما لکھتا ہے۔

دولت کی زیادتی سے مستی بڑھتی
اور برائیوں میں اضافہ ہوتا ہے
دولت کے گھٹنے سے مستی کم ہوتی ہے
ساتھ ساتھ برائیاں بھی کم ہو جاتی ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۴۸)

جس طرح دولت کی زیادتی آدمی کو پریشان کر دیتی ہے اسی طرح مفلسی بھی انسان کو تکالیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ غریبوں کو حالتِ زار کا بیان کرتے ہوئے حضرت

امجدؔ لکھتے ہیں:

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں
مردود درِ جیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

(پیامِ امجدؔ، ص:۱۰۹)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

غربت ایک لعنت ہے
اور یہ ایک آگ ہے
یہ خود کو جلا دیتی ہے
سارے خاندان کو راکھ کر دیتی ہے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:۲۵)

حضرت امجدؔ اور ویماؔ غریبوں کی تباہ کن حالت کو دیکھ کر سماج کے ان امیروں پر برس پڑتے ہیں جو بخیل ہوتے ہیں۔ جن کے پاس پیسہ ہونے کے باوجود وہ غریبوں کی مدد نہیں کرتے ۔ یہاں تک کہ اپنے آپ پر خرچ کرنے سے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

بیمار بخیل سے کسی نے یہ کہا
کر جان کے واسطے نہ زر کی پروا

کہنے لگا واہ واہ کچھ عقل بھی ہے

جان مفت میں پائی مال محنت سے ملا

(گلستا مجد ن اص:۱۸۷)

اور ویما لکھتا ہے۔

کنجوس کے گھر موت واقع ہوتو

تدفین کے لئے پیسہ تو خرچ کرتا ہے۔

مگر بعد میں روتا پیٹتا ہے کہ

خواہ مخواہ کتنا، خرچ اٹھانا پڑا

(ویمنا پدیا رتنا کرمو،ص:۳۸۷)

انسان کو چاہیے کہ وہ حقائقِ زندگی کو دیکھے، سمجھے اور انہیں انسانی فلاح و بہبودی کی خاطر استعمال کرے۔ آدمی کا مقصدِ عین بھی یہی ہونا چاہیے۔ مگر انسان دنیوی خواہشات کے جال میں پھنس کر گمراہ ہوجاتا ہے۔ بالخصوص دولت، عورت اور شہرت کو پانے کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ایمان کو بھی داؤ پہ لگا دیتا ہے۔ حضرت امجد اور ویما نے اپنے کلام کے ذریعہ لوگوں کو خواہشات کی اصل نوعیت سے آگاہ کیا ہے، اور انسان کو راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کی ہے۔ انسان کس قدر دولت کا خواہش مند ہے، اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے حضرت امجد لکھتے ہیں:

عقبہ کا خیال ہے نہ خوفِ رب ہے

روپیہ مقصد ہے روپیہ مطلب ہے

دنیا والوں کا دین ہے زر طلبی
سچ تو یہ ہے کہ ذہب ماخذِ مذہب ہے

(گلستانِ امجدؔ، ص:۲۰۵)

اور ویماؔ کو ایسا انسان ہی نظر نہیں آتا جو عورت' دولت اور شہرت کا خواہش مند نہ ہو۔ لکھتا ہے:

دھن دولت، عورت کے لب
علم و سرکاری عہدے کی خواہش
نہ رکھنے والا انسان
اس دنیا میں موجود نہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۸۵)

شہوت انسان کو کس قدر گرا دیتی ہے' اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

بڑھا کے ہاتھ کسی مست ناز نے امجدؔ
مرے وجود کے دامن کو تار تار کیا
تمام زہد عبادت پہ پھر گیا پانی
سپید چڑے نے مجھ کو سیاہ کار کیا

(گلستانِ امجدؔ، ص:۱۶۳)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

انسان کو سب سے پیاری اپنی جان ہے

جان سے بھی پیارا سونا

سونے سے زیادہ دلکش
جوان لڑکی کے میٹھے بول ہیں

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۸۹)

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

انسان پاگل ہو یا سنیاسی
مریض ہو یا پہنچا ہوا جوگی
عورت کو دیکھتے ہی اس کا دل
ڈاواں ڈول ہو جاتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو،ص:۵۸۰)

عورت کے حسن کا جادو کس طرح آدمی کو اپنے بس میں کر لیتا ہے حضرت امجد لکھتے ہیں۔

الفت میں عجب دردِ سری ہوتی ہے
دل جلتا ہے آنکھوں میں تری ہوتی ہے
فولاد سے سخت دل بھی پگھل جاتے ہیں
اچھی صورت بھی کیا بری ہوتی ہے

(گلستانِ امجد،ص:۱۰۳)

اور ویما لکھتا ہے:

حسین عورت پر نگاہ پڑتے ہی
ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے

دل موم کی مانند پگھل جاتا ہے
اور آدمی پاگل ہو جاتا ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۲۳۹)

حرص و ہوس کے پھندے سے اگر دور رہنا ہے تو انسان کو نفس پر قابو پانا ضروری ہے۔ مگر یہ فعل نہایت ہی مشکل ہے۔ حضرت امجؔد اور ویمؔا اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ نفس پر قابو پانا کتنا مشکل ہے۔ فرماتے ہیں:

بقولِ حضرت امجؔد:

اس دل کو سنبھالنے کی قوت مل جائے
مجھ کو میرے ہی گھر کی دولت مل جائے
کونین کی شاہی کی طرف رخ نہ کروں
اے کاش، مجھے مجھ پہ حکومت مل جائے

(جمالِ امجد، ص:۲۱۲)

بقولِ ویمؔا:

جو جسم میں بسا ہے، اس کو میں جانوں کیسے
یہ نفس ایک بندر، اس کو سنبھالوں کیسے
ویمؔا خدا کے پیارے، سن لو ہمارا کہنا
بندر کو اپنے من سے آخر نکالوں کیسے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۲۳۸)

ایک اور جگہ حضرت امجدؔ لکھتے ہیں:

تقدیس کا اپنی کبھی دعویٰ نہ کرو
اس لاف زنی سے حشر برباد نہ کرو
اک مرتبہ دشمن کا کہا بھی سن لو
لیکن کبھی نفس کا بھروسہ نہ کرو

(گلستانِ امجدؔ، ص:۲۰۲)

اور ویماؔ لکھتا ہے:

جس طرف نفس متوجہ ہوتا ہے
حواس کا رخ ادھر ہی ہوتا ہے
اگر نفس کو اپنے قابو میں رکھو
تو حواس بھی کہیں نہیں بھٹکیں گے

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۴۳۳)

نفس کو قابو میں لانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ انسان صبر کا دامن تھامے رکھے۔ کیوں کہ انسان کو ہر منفی چیز جلد مانوس کرلیتی ہے اور اپنے جال میں پھانس لیتی ہے۔ آدمی فطرتاً جلد باز ہونے کی وجہ سے وہ اس جال میں پھنس جاتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ صبر سے کام لے اور اس میں چھپی انسانی قوتوں کو یہ موقع دے کہ وہ منفی خواہشات کو کچل ڈالے۔ حضرت امجدؔ اور ویماؔ صبر کی اہمیت اور افادیت سے بخوبی واقف تھے۔ اور وہ اس کی تلقین یوں کرتے ہیں۔

حضرت امجد فرماتے ہیں:

بے صبر کی جان ہمیشہ گھبراتی ہے
تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے
آسان ہوتی ہے صبر سے ہر مشکل
ہر قفل میں یہ کلید ٹھیک آتی ہے

(رباعیات امجد حصہ سوم، ص:٦٠)

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے
کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ نا صبور تیرا ہر کام
کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

(رباعیات، امجد حصہ سوم، ص:٤٣)

اور ویما لکھتا ہے:

'نسان عالم و فاضل بن سکتا ہے
زبان پر قدرت رکھ سکتا ہے
مگر صابر بننا اس کے لیے
نہایت ہی مشکل ہے

(ویمنا پدیار تنا کرمو، ص:٦٦)

عورت اور اس کے نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بھی حضرت امجدؔ اور ویماؔ نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ بری عورت کی بدمعاشی اور بے وفائی کے تعلق سے حضرت امجدؔ کہتے ہیں:

اپنے آقا سے کج ادائی توبہ
نااہلوں کے در پہ جبہ سائی توبہ
غیروں سے تعلقات رب کے ہوکر
شوہر رکھ کر بھی آشنائی توبہ

(میاں بیوی کی کہانی، ص:۱۲)

اور ویماؔ کہتا ہے:

بری عورت بروں کو چاہتی ہے
سچے عاشق کو نہیں چاہتی
گوبر کھانے والے کیڑے کو
گڑھ کا مزہ کیا معلوم!

(ویمنا پدیا رتنا کرمو، ص:۲۵۲)

نیک بیوی کی محبت اور خوش باش زندگی کے متعلق حضرت امجدؔ اور ویماؔ کے خیالات ملاحظہ کیجئے۔ حضرت امجدؔ فرماتے ہیں:

دو دل اک ہوں تو نخلِ جاں پھلتا ہے
دل گود میں حسن و عشق کی پلتا ہے

امجدؔ ! بجلی کی روشنی کی مانند
دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

(رباعیاتِ امجد، حصہ اول، ص:۴۲)

اور ویمؔا لکھتا ہے:

میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں
اوران کی لائق اولاد ہو
بڑھاپہ میں ساتھ دینے والی بیوی ہو
یہی سب سے بڑی دولت ہے

(ویمنا پدیارتنا کرمو، ص:۵۸۸)

حضرت امجدؔ اور ویمؔا کا یقین تھا کہ نیک شریک حیات گھر کو جنت میں بدل دیتی ہے۔

اختتامیہ:

غرض حضرت امجدؔ اور ویمؔا دو مختلف زبانوں کے شاعر ہونے کے باوجود ان کی اختیار کردہ اصناف سخن اور موضوعاتِ شاعری میں کئی طرح کی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ نیز ان کے عہد اور حالاتِ زندگی میں بھی خاصی مماثلتیں موجود ہیں۔

حضرت امجدؔ کی زندگی اور ویما کی قیاسی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں شاعر موجودہ ریاست آندھرا پردیش سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی کے عروج و زوال کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور تلخ سے تلخ تجربات کا سامنا بھی کیا تھا۔ مگر حالات اور زمانے سے ہار نہیں مانی بلکہ نڈر ہو کر ان کا سامنا کیا تھا۔ اور زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

حضرت امجدؔ اور ویمؔا نے اپنے دور کے ادبی ماحول میں اپنی شاعری کی ایک

الگ پہچان بنائی تھی ۔ حضرت امجدؔ نے خالص روحانی جذبات وکیفیات ، اخلاقیات ، انسان دوستی جیسے موضوعات پرقلم اٹھا کر اپنی ایک خاص پہچان بنائی ہے تو ویماؔ نے بھی اپنے دور کی روایتی شاعری سے پرہیز کر کے خدا پرستی ، اعلیٰ انسانی اقدار ، اخلاقیات وغیرہ جیسے موضوعات پر زور دے کر تلگو ادب میں ایک نئے شعری دبستان کا آغاز کیا ہے۔

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کو جس صنف پر مہارت حاصل تھی وہ چار مصرعوں یا چار سطروں والی مختصر نظم تھی ۔ حضرت امجدؔ نے خاص طور پر رباعی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا تھا ۔ اور ویماؔ نے جس صنف میں مقبولیت حاصل کی تھی وہ آٹا ویلیدی ہے ، جس میں چار سطریں ہوتی ہیں ۔ ان اصناف کا یہ بھی ایک مشترک پہلو ہے کہ مذہبی ، اخلاقی ، فلسفہ ، تصوف وغیرہ سنجیدہ مضامین کا یہ خاص وسیلۂ اظہار ہیں ۔ حضرت امجدؔ اور ویماؔ دونوں نے رباعی اور آٹا ویلیدی کے پیرائے میں ان موضوعات کو پیش کیا ہے ۔

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کی زبان سادہ عام فہم ہے ، جسے ہر ادنیٰ واعلیٰ با آسانی سمجھ سکتا ہے ۔ انہوں نے اپنے احساسات وتجربات کو سادہ لفظوں میں بلا تکلف ادا کر دیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بلا کی روانی پائی جاتی ہے ۔ نیز انہوں نے اپنے کلام میں کثرت سے تمثیلی انداز اپنایا ہے ۔ تاہم اظہارِ خیال کے لئے جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ نسبتاً الگ ہے ۔ حضرت امجدؔ کی شاعری میں نرمی ودل آویزی پائی جاتی ہے ۔ جبکہ ویماؔ نے اکثر تلخ وسخت لہجے سے کام لیا ہے ۔

حضرت امجدؔ اور ویماؔ کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ انسان کی فلاح و بہبود ہے ۔ انسان کو انسان بنانا ، اس کو حقائق زندگی سے آگاہ کرانا اور خدا پرستی کا درس دینا ہی ان کے کلام کا نچوڑ ہے ۔

کتابیات

نمبر	مصنف/مرتب	تصنیف	ناشر/طابع/سنہ اشاعت
۱	آل احمد سرور	فکرِ روشن	ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ، ۱۹۸۴ء
۲	اکبرالدین صدیقی	یادگارِ امجد	ابراہیم پریس حیدرآباد، ۱۹۶۱ء
۳	امجد حیدرآبادی	رباعیاتِ امجد (حصہ اوّل)	احباب پریس، نام پلی، حیدرآباد
۴	,,	رباعیات امجد (حصہ دوم)	اعجاز پرنٹنگ پرس چھتہ بازار۔ حیدرآباد
۵	,,	رباعیات امجد (حصہ سوم)	عماد پریس۔ حیدرآباد
۶	,,	ایوب کی کہانی	اعظم جاہی، شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد، ۱۳۶۷ء
۷	,,	پیامِ امجد	,, ۱۳۶۸ھ
۸	,,	جمالِ امجد	,, ۱۳۶۵ھ
۹	,,	حجِ امجد	اعظم جاہی، برقی پرس، حیدرآباد، ۱۳۶۶ھ
۱۰	,,	حکایاتِ امجد	نیشنل پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۲ء
۱۱	,,	خرقۂ امجدی پیوند	عماد پریس حیدرآباد، ۱۹۷۴ھ
۱۲	,,	ریاضِ امجد (حصہ دوم)	عماد پریس۔ حیدرآباد، ۱۳۷۰ھ
۱۳	,,	ریاضِ امجد (حصہ اوّل)	عماد پریس۔ حیدرآبادی
۱۴	,,	میاں بیوی کی کہانی	اعظم جاہی، برقی پرس، حیدرآباد، ۱۳۶۵ھ
۱۵	,,	نذرِ امجد	عماد پریس۔ حیدرآباد
۱۶	,,	گلستانِ امجد	,, ۱۳۷۲ھ
۱۷	تنویر احمد علوی	اصولِ تحقیق و ترتیب متن	,, ۱۹۹۴
۱۸	جمیل جالبی	تاریخ اردو ادب جلد اول و دوم	ایجوکیشنل بک ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی، ۱۹۸۴

۱۹	جوادرضوی سید محمد	ریاستِ حیدرآباد میں جدوجہدِ آزادی	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
۲۰	حمیدالدین شاہد خواجہ	حیدرآباد کے شاعر	آندھرا پردیش، ساہتیہ اکادمی۔ حیدرآباد، ۱۹۵۸ء
۲۱	حمیدالدین شاہد	ارمغانِ امجد	ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل۔ خیرت آباد، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء
۲۲	زورؔ سید محی الدین قادری	امجد نمبر (سب رس)	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔ ۱۹۶۲ء
۲۳	رامانجاراؤ، زینت ساجدہ	تلگو ادب کی تاریخ	انجمن ترقی اردو، حیدرآباد ۱۹۶۰ء
۲۴	سیدہ جعفر	دکنی رباعیاں	آندھرا پردیش، ساہتیہ اکادمی۔ حیدرآباد، ۱۹۶۶ء
۲۵	شارب ردولوی	معاصر اردو تنقید مسائل اور میلانات	اردو اکادمی، دریا گنج، دہلی، ۱۹۹۴
۲۶	شہناز انجم	ادبی نثر کا ارتقاء	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۸۵ء
۲۷	صالحہ عابد حسین	یادگارِ حالؔی	انجمن ترقی اردو، اردو گھر۔ نئی دہلی ۱۹۹۵ء
۲۸	عبدالسلام سندیلوی	اردو رباعیات	تعلیم بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۶۳ء
۲۹	فرمان فتحپوری	اردو نثر کا فنی ارتقا	ایجوکیشنل بک ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی، ۱۹۹۷ء
۳۰	قدیر امتیاز	تقابل و تجزیہ	" ۱۹۸۲ء
۳۱	گوپی چند نارنگ	ادبی تنقید اور اسلوبیات	ایجوکیشنل بک ہاؤس، کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی، ۱۹۸۹
۳۲	مالک رام	تحقیقی مضامین	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۸۴ء
۳۳	مشفق خواجہ	تحقیق نامہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۱۹ء
۳۴	مظفر شہ میری	حفیظ جالندھری کا تنقیدی مطالعہ	ہلال پریس، ٹرپلیکن، مدراس، ۱۹۷۷ء
۳۵	مظہرالدین محمد	زوال حیدرآباد اور پولس ایکشن	--
۳۶	مولانا منظور نعمانی	تصوف کیا ہے	الفرقان بک ڈپو۔ لکھنو، مطبوعہ۔ ۱۹۸۷ء
۳۷	میر ولی الدین	قرآن اور تصوف	یونین پریس۔ دہلی، ۱۹۵۶ء

۳۸	میر ولی الدین	فلسفہ کیا ہے	اشوکا پریس۔ دہلی۔ ۱۹۵۱ء
۳۹	نصیر الدین ہاشمی	دکن میں اردو	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء
۴۰	وارث کرمانی	افکار وانشاء	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء
۴۱	وحید اشرف۔ سید	رباعی (حصہ سوم)	ادارۂ تحقیق وتصنیف دائرہ طریقت اشرفیہ، مدراس ۱۹۹۲ء
۴۲	”	رباعی	بشیر وراثی پبلیکیشنز حیدرآباد، ۱۹۸۷ء
۴۳	وہاج الدین علوی	اردو خود نوشت فن وتجزیہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۹۹ء
۴۴		ویمنا کے منتخب اشعار کا ہندی اور اردو ترجمہ	تلگو اکیڈمی ۱۹۷۰ء
۴۵	فضل الرحمٰن	(اردو انسائیکلوپیڈیا (جلد اول تا سوم)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶

رسائل وجرائد:

۱	الرسالہ (ماہنامہ)	نومبر ۲۰۰۱ء	ا، نظام الدین، ویسٹ مارکٹ، نئی دہلی
۲)	سب رس (ماہنامہ)	جنوری ۱۹۵۵ء	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔
۳)	سب رس (ماہنامہ)	نومبر ۱۹۶۵ء	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔
۴)	سب رس (ماہنامہ)	فروری ۱۹۶۵ء	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد۔

تحقیقی مقالات:

۱	امجد حیدرآبادی حیات اور کارنامے	عثمان علی اسد	عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد
۲	حضرت امجد کی حیات وکارنامے	عظیم الدین محبت	عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد
۳	مخدوم اور داسرتھی کا ادبی تقابلی مطالعہ	قاسم علی خان	ایس وی یونیورسٹی، تروپتی
۴	رائل سیما میں اردو نظم کا ارتقاء ۱۹۳۶ء کے بعد	عطاء اللہ خان سجری	ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

تلگو کتب

	مصنف	تصنیف	ناشر / سنہ اشاعت
۱	بلاراما مورتی	آندھرا سنکشپتا چرترا	وسالا آندھرا پبلیشنگ ہاؤس، وجے واڑا۔
۲	بلوسو وینکٹا رامیا	ویمنا پدیارتنا کرمو	بالاسرسوتی بک ڈپو، مدراس۔۱۹۸۶ء
۳	پٹابھی ویرراجو	ویمنا ستکمو	سری سیتاراما بک ڈپو، راجامنڈری، ۱۹۹۷ء
۴	تمیابنڈارو	ویمنا چرترا	سری نرملا سیوا ساہتی گرندھامالکا، کاکی ناڈا ۱۹۷۰ء
۵	راجیشورراؤ، پی	نگامینا نیلالو ویمنا پدیالو	پرتبھا پبلیکیشن، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء
۶	رامالنگاریڈی کٹامنچی	کوتوا تتواوچارمو	واولاراما سوامی اینڈ سنس، ۱۹۴۱ء
۷	سرورم پرتاپاریڈی	آندھرا ساںگھیکا چرترا	آندھرا سرسوتی پریشت، حیدرآباد۔
۸	شرما، آر۔اے	ویمنا	آندھرا وسواکلا پرشت، ۱۹۲۸ء
۹	گوپی چند	تتواویتالو	دیسی کویتا منڈلی، وجے واڑا، ۱۹۶۹ء
۱۰	گوپی۔ین	پرجا کوی ویمنا	وسالا آندھرا پبلیشنگ ہاؤس، حیدرآباد۔۲۰۰۰ء
۱۱	گوپی۔ین	ویمناوادم	حیدرآباد بک ٹرسٹ، حیدرآباد۔۱۹۹۸ء
۱۲	لکشمی رنجنم، کھنڈاپلی	آندھرا چرترا سنسکرتی	بالاسرسوتی بک ڈپو، مدراس۔۱۹۷۴
۱۳	ونگوری ستباراؤ	ویمنا	کملاکوٹیرا پریس اینڈ پبلیکیشنگ، نرساپور، ۱۹۲۲

انگریزی کتب

1. Brown .C.P. The verses of Vemana Moral, devout, Mystical and satirical, American Mission press, Popham house- Madras. -1839.
2. Brown .C.P The verses of Vemana,Moral,Religious and Satarical, Madras-1829
3. Dubiou Abbe, J.A. Hindu Manners, Customs and Ceremonles,Translated by Henry K. Beavchamp. Oxford at clarendon press 1906.
4. Krishna Rao,G.V. Vemana (History& Philosophy),Half way The Golden book 1958
5. Narla .V.R. "Vemana Through western eyes", M.Sesha chalan, Madras1969
6. Narla.V.R. Vemana (Makers of Indian Literature series), Sahitya Academy,New Delhi
7. Topa Iswara, Saint Vemana and his philospphy,Telugu Academy,Hyd,1950.